تعلیم و تربیت
ستمبر 1989ء

اپنے شہر کے
کُتب فروش سے طلب کیجیے

## 5 سال سے 8 سال تک کے بچّوں کے لیے

نہایت دِل چسپ اور مزیدار کہانیاں

آسان زبان ☼ جلی کتابت

ہر کہانی رنگین اور خُوب صُورت تصویروں سے سجی ہُوئی!

سنڈریلا

ہنسل اور گریٹل

بی مانو کہاں چلیں؟

چندا رانی

لال ٹوپی والی

ایک بھیڑیا، سات میمنے

رمپل ڈمپل

چار دوست

واہ رے عقل مند

سفید گلاب، سُرخ گلاب

فیروزسنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

کلاسک
چوتھی قسط

صفحہ 52 سے 55 تک

انچاسواں سال ۔ چھٹا شمارہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر : عبدُالسّلام
ایڈیٹر : ظہیر سلام
سینیئر اسسٹنٹ ایڈیٹرز : مقبول انور داؤدی، ڈاکٹر عبدالرؤف
جائنٹ ایڈیٹر : سعید لخت
اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد اقبال ثاقب
آرٹ ڈائریکٹر : محمود حسن رُومی
سرکولیشن منیجر : الطاف احمد
ایڈورٹائزنگ منیجر : مبشر علی خان
ڈسٹری بیوشن منیجر : شہزاد اصغر
اکاؤنٹس منیجر : محمد انور بھٹی
جنرل منیجر پروڈکشن : ایم جاوید خان
منیجر پلاننگ : فاروق عالم
سرکولیشن اسسٹنٹ : محمد تشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
پبلشر : ظہیر سلام
پرنٹر : عبدالسّلام

شعبہ اِدارت و اشتہارات
32۔ شارع بن بادیس (ایمپرس روڈ) لاہور
فون: 226819-320592

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60۔ شاہراہ قائد اعظمؒ لاہور
فون:- 97-301196

راولپنڈی آفس
277۔ پشاور روڈ
فون:- 64273-63503

کراچی آفس
مہران ہاؤس ۔ مین کلفٹن روڈ
فون:- 537730

ستمبر 1989

قیمت فی پرچہ =/8 روپے

سرورق: رفیل ٹکٹ

بِسمِ اللہِ الرّحمٰنِ الرّحیمْ

السّلامُ علیکم

تعلیم و تربیت کا یہ شُمارہ جب آپ کو مِلے گا ، آپ کے اِسکول کُھل چکے ہوں گے اور آپ پڑھائی میں مصروف ہوں گے ۔ خُوب دِل لگا کر پڑھیے ، اور اِمتحانوں میں زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی کوشش کیجیے لیکن ایک بات یاد رکھیے۔ جو بچّے صِرف درسی یعنی کورس کی کتابیں ہی پڑھتے ہیں ، وہ کولھو کے بیل ہوتے ہیں ۔ وہ ایک ہی دائرے میں گھومتے رہتے ہیں ۔ اِس لیے درسی کتابوں کے ساتھ ، فُرصت کے وقت ، ایسی غیر درسی کتابیں بھی پڑھیے جن سے آپ کے عِلم میں اِضافہ ہو ، جو آپ کی سِیرت و کِردار کی تعمیر کریں ، جو آپ کو تعمیری تفریح مُہیّا کریں اور آپ کو ایک اچّھا شہری بننے میں مدد دیں ۔ ایسی کتابوں کے اِنتخاب میں آپ کے والدین آپ کی راہ نُمائی کر سکتے ہیں ۔

ایڈیٹر

## فہرست مضامین

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| اِداریہ | 1 |
| گاؤں کا چاند (نظم) شبیر بیگ ناز | 2 |
| ایک سبق (کہانی) میرزا ادیب | 3 |
| ریفل ٹکٹ (کہانی) سعید لخت | 7 |
| میں نے نیولے پالے (کہانی) محمد یونس حسرت | 10 |
| اُف! یہ آگ (کہانی) رضوانہ سید علی | 13 |
| انگوٹھی کہاں گئی؟ (سیریل) اے حمید | 15 |
| دل چسپ اور عجیب | 22 |
| جلدی قدم اٹھاؤ (نظم) حفیظ الرحمٰن احسن | 23 |
| کیوں اور کیسے | 24 |
| پھول سی تتلی (کہانی) محمد اقبال ثاقب | 26 |
| شاہی محل سے فرار (قرآنی کہانی) ڈاکٹر عبد الرؤف | 29 |
| نیٹ بال (سپورٹس) | 30 |
| اور گڈّو میاں غائب ہو گئے (کہانی) نیل کنول | 32 |
| داؤدی علمی آزمائش | 35 |
| فریکچر (فرسٹ ایڈ) ڈاکٹر شاہد صدیق | 36 |
| آیئے، دوست بنائیں | 39 |
| درویش اور بادشاہ (کہانی) مقبول انور داؤدی | 40 |
| آپ کا خط ملا | 42 |
| بلا عنوان | 44 |
| آپ بھی لکھیے | 45 |
| ہونہار مُصوّر | 49 |
| لوہا اور فولاد (سائنس) امجد علی | 50 |
| شیر شاہ سوری (کلاسک) | 52 |
| بٹیر (وائلڈ لائف) | 56 |

# گاؤں کا چاند

چوبارے کی اوٹ سے نِکلا　　گاؤں کا البیلا چاند
ساری خلقت دیکھنے نِکلی　　اُجلا ، چھیل چھبیلا چاند

شہر کا چندا گدلا گدلا　　گاؤں کا نِکھرا نِکھرا چاند
شہر کا چندا اُلجھا اُلجھا　　گاؤں کا سُلجھا سُلجھا چاند

چُپکے چُپکے چلتا جائے　　کھیت کھیت کے اُوپر چاند
چاندی اُن میں بھرتا جائے　　اندھیاروں کو چُھو کر چاند

حُقّے کی گُڑ گُڑ کو لے کر　　آیا ہے چوپال پہ چاند
کلیوں کو چٹکاتا جائے　　چُٹکی لے کر گال پہ چاند

ہر آنگن میں یکساں اُترے　　گاؤں کا سیدھا سادہ چاند
شہر کے پُورے چاند کے آگے　　گاؤں کا اچّھا ، آدھا چاند

شبّیر بیگ ناز

دیہاتوں میں رہنے والے لوگ ڈاکٹر رحمت علی کو اللہ کی رحمت سمجھتے تھے اور وہ تھے بھی اللہ کی رحمت ۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ معمول تھا کہ وہ گاؤں گاؤں جاتے اور آنکھوں کے مریضوں کا عِلاج کرتے ۔ اُن کی کوئی فیس نہیں تھی ۔ بلکہ وہ مریضوں کو دوائیں بھی مُفت دیتے تھے ۔ وہ جِس گاؤں میں بھی جاتے، وہاں بارہ تیرہ روز صُبح سے شام تک مصروف رہتے اور اِس کے بعد اُن کا ٹرک اس گاؤں سے کسی دوسرے گاؤں میں چلا جاتا اور وہاں بھی یہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ڈاکٹر صاحب کے ٹرک میں اُن کا خیمہ اور عملہ ہوتا تھا ۔ دواؤں کے بکسوں کے عِلاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوتی تھیں ۔ وہ کسی جگہ بھی کسی سے کچھ مانگتے نہیں تھے ۔ باورچی ساتھ ہوتا تھا جو اُن کے اور اُن کے عملے کے لئے کھانا تیار کرتا تھا ۔

شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں پندرہ روز آنکھوں کے مریضوں کا علاج کرنے کے بعد وہ اُس روز نئے گاؤں میں داخل ہو گئے تھے ۔ جیسے ہی اُن کا ٹرک وہاں پہنچا تھا، سارے گاؤں میں "ڈاکٹر رحمت آگئے!" کا شور مچ گیا تھا ۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر خیمہ لگا دیا گیا، میزوں کے اُوپر دوائیں اور علاج کے لئے سارا سامان رکھ دیا گیا ۔ مریض آنے شروع ہو گئے ۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک نوکر مریضوں کو اُن کی باری کا نمبر دینے لگا ۔

ابھی ڈاکٹر صاحب کُرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ گاؤں کے ایک بڑے زمیندار کے بیٹے سلیم شاہ کا نوکر ایک لفافہ لے کر آگیا ۔

"کہاں سے آئے ہیں آپ، اور کیوں آئے ہیں"؟ ڈاکٹر صاحب نے اُس سے سوال کیا ۔

"میں چھوٹے سرکار سلیم شاہ صاحب کی طرف سے آیا ہوں ۔ یہ لفافہ آپ کے نام ہے" ۔

ڈاکٹر صاحب نے لفافہ چاک کِیا ۔ کاغذ پر یہ تحریر درج تھی:

رحمت علی، سلام علیکم

"میں سلیم شاہ ہوں ۔ تمہارا پُرانا کلاس فیلو ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں ۔ فوراً میرے نوکر کے ہمراہ آجاؤ ۔ گاڑی بھیج رہا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ عبارت پڑھی اور نوکر سے کہا "بھائی، دیکھو ۔ مریض آگئے ہیں ۔ میں اِنہیں چھوڑ کر کیسے کہیں جا سکتا ہوں؟ یہ بات سلیم شاہ صاحب سے کہہ دینا" ۔

نوکر یہ سُن کر حیران رہ گیا ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چھوٹے سرکار کسی کو بُلائیں تو یہ اُس کی خوش قسمتی ہے، مگر یہ کیسا آدمی ہے کہ اُن کی ملاقات پر مریضوں کو ترجیح دے رہا ہے ۔ نوکر چلا گیا تو ڈاکٹر صاحب مریضوں کو دیکھنے لگے ۔ یہ اُن کا پہلا دن تھا اور وہ مریض جو کئی روز سے بڑی بے تابی کے ساتھ اُن کا انتظار کر رہے تھے، جوق در جوق چلے آ رہے تھے ۔

شام ہو گئی تو ایسے سارے مریض دیکھے جا چکے تھے جن کے نام ڈاکٹر صاحب کے نوکر نے رجسٹر میں لکھ لئے تھے اور وہ اپنی اپنی باری پر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے ۔ ڈاکٹر صاحب ابھی کُرسی سے اُٹھے نہیں تھے ۔ وہ سارے مریضوں کو دیکھنے کے بعد بھی آدھ گھنٹا اپنی جگہ بیٹھے رہتے تھے کہ شاید کوئی اور مریض آجائے ۔ وہ کسی مریض کو مایوس کرنا نہیں چاہتے تھے ۔ اِتنے میں گاڑی کے ہارن کی آواز آئی ۔ خیمے کے دروازے کے سامنے ایک بڑی سی موٹر کار آکر رُکی ۔ اُس میں سے ڈاکٹر صاحب کی عمر کا ایک آدمی نکلا اور خیمے میں داخل ہو گیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً پہچان لیا ۔ یہ اُن کا پُرانا دوست اور کلاس فیلو سلیم شاہ تھا ۔

سلام کے بعد سلیم شاہ نے پہلا فقرہ یہ کہا "میں نے بُلایا تھا ۔ آئے کیوں نہیں؟"

ڈاکٹر صاحب بولے "مریضوں کو چھوڑ کر کیسے آسکتا تھا؟"

"یہ گنوار مریض مجھ سے بہتر ہیں؟" سلیم شاہ نے غصّے سے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب چند لمحے خاموش رہے ۔ پھر کہنے لگے "سلیم شاہ، میں یہاں اپنے دوست سلیم شاہ سے مِلنے کے لئے نہیں آیا ہوں ۔ آنکھوں کے مریضوں کا علاج کرنے آیا ہوں" ۔

سلیم شاہ کو اِس جواب کی توقع نہیں تھی ۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو گھور کر دیکھا ۔ ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر ارادے کی پختگی نُمایاں تھی ۔

"اگر یہ بات ہے تو میں جاتا ہوں" سلیم شاہ کُرسی سے اُٹھ بیٹھا ۔

"ٹھیک ہے ۔ اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو جائیے ۔ میں ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آپ کے ہاں آجاؤں گا" ۔

سلیم شاہ ایک لمحہ رکے بغیر چلا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے معمول کے مطابق سارے کام کیے اور جب فارغ ہو گئے تو تنہا پیدل سلیم شاہ کی حویلی کی طرف قدم اُٹھانے لگے ۔ یہ بہت بڑی اور شان دار حویلی تھی ۔ دروازے پر پہرے دار موجود تھے ۔ چند مِنٹ میں سلیم شاہ کو ڈاکٹر صاحب کے آنے کی اِطلاع ہو گئی ۔ وہ خود دروازے پر نہیں آیا ۔ اپنے خادم کو بھیجا کہ ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے آئے ۔

سلیم شاہ کا غصہ دور نہیں ہوا تھا ۔ اِس کے مقابلے میں ڈاکٹر صاحب مسکرا رہے تھے ۔

"دیکھو، رحمت علی ۔ تم نے میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کِیا ہے ۔ ایسا سلوک میرے لئے توہین آمیز ہے ۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تُم نے ایسا کیوں کیا؟"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "سلیم شاہ، میں اِس کا جواب دے چُکا ہوں کہ میں یہاں آنکھوں کے مریضوں کو دیکھنے آیا ہوں ۔ کسی دوست سے ملاقات کے لئے نہیں" ۔

"کیا مریضوں کو دیکھنا ایسا ہی ضروری ہے؟"

"جی ہاں" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "یہ میری ڈیوٹی ہے، میرا مِشن ہے اور میرا مقصد ہے۔"

"کیوں؟" سلیم شاہ نے پوچھا ۔

"اِس کا جواب ایک فِقرے میں نہیں دے سکتا ۔ اِس کے

لئے مجھے ایک واقعہ سنانا پڑے گا۔"

"سناؤ ۔ میں یہ واقعہ ضرور سنوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب دو تین لمحے چُپ رہے، جیسے سوچ رہے ہوں کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اِس کا آغاز کس طرح کریں ۔ آخر اُنہوں نے سوچ لیا اور کہنے لگے "یہ واقعہ 1965 کی پاک بھارت جنگ کے شروع میں پیش آیا تھا ۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ایف ۔ ایس ۔ سی کا امتحان پاس کر لیا تھا اور میرے ابا جان مجھے لندن بُلا رہے تھے ۔ وہاں اُن کا ایک بہت بڑا اسٹور ہے ۔ میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ جنگ شروع ہو گئی ۔ چھ ستمبر کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا ۔ باٹا پور کا علاقہ حملے کی زد میں تھا ۔ وہاں رہنے والے پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر جا رہے تھے ۔ پاکستانی فوج بڑی بہادری سے حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہی تھی ۔ فضاؤں میں قومی ترانے گونج رہے تھے ۔ شہری لوگ حفاظتی تدبیروں پر عمل کر رہے تھے ۔

میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ مُحلّے میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا ۔ اُسی وقت باہر نکل آیا ۔ وہاں پہنچا جہاں جھمگٹا لگا تھا تو معلوم ہوا کہ ایک خاندان جو باٹا پور میں رہتا تھا، بڑی مشکلوں سے اپنے عزیزوں کے ہاں آگیا ہے ۔ وہاں مجھے ایک چھوٹا سا لڑکا دِکھائی دیا جو بُری طرح رو رہا تھا ۔ میں نے اُس سے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ صرف چچا جان کہہ سکا ۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا چچا گولی کا نشانہ بن گیا ہے ۔ مگر جب دوسروں سے اِس معاملے کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ اس کے خاندان کا ایک آدمی جسے بُہت کم دکھائی دیتا تھا ، وہیں باٹا پور میں کہیں کھو گیا ہے ۔ یہ سُن کر میں نے ارادہ کر لیا کہ باٹا پور جاؤں گا اور اُسے ڈھونڈوں گا ۔ اتفاق سے میں اُس آدمی سے واقف تھا ۔ میں نے کسی سے اپنے اِس ارادے کا ذِکر نہ کیا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر باٹا پور کی جانب روانہ ہو گیا ۔

راستے میں دیکھا کہ لوگ چھکڑوں میں ، گاڑیوں میں اور ٹرکوں میں بیٹھ کر آ رہے ہیں ۔ بڑی پریشانی کا عالم تھا ۔ میں تیزی سے آگے بڑھتا گیا ۔ مگر جب باٹا پور کے قریب پہنچا تو پاکستانی سپاہیوں نے مجھے آگے جانے سے روک دیا اور کہا کہ اُدھر گولیاں برس رہی ہیں ۔ وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے ۔

میں نے اُنہیں اپنے آنے کی وجہ بتائی تو ایک نیک دل سپاہی نے کہا:

"ہم نے کچھ لوگوں کو نکال کر اپنی حفاظت میں لے لیا ہے ۔ یہ لوگ اسکول کے اندر رکھے گئے ہیں ۔ میں آپ کو اُس اسکول میں لے چلوں گا ۔ ممکن ہے وہ وہاں ہو"۔

خُدا خُدا کر کے میں اسکول پہنچا ۔ وہاں کئی لوگ جمع تھے جو اپنے اپنے عزیزوں کو لے جا رہے تھے ۔ میری نظر اُس آدمی پر پڑ گئی اور میں اُسے اپنے پیچھے بٹھا کر صحیح سلامت گھر لے آیا ۔ سب نے مجھے بڑی شاباش دی ۔ اُس آدمی نے مُجھ سے کہا کہ بیٹا ، اگر میری نظر اِتنی کم زور نہ ہوتی تو میں بھی کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل آتا ۔ نظر کی کمزوری نے مجھے بے سہارا کر دیا ۔ اُس کے اِسی فقرے نے مُجھے ایک نئی سوچ دی ۔ میں نے سوچا، کیوں نہ میں کسی طرح اپنی قوم کے کام آؤں ۔ کوئی ایسا کام کروں جو صرف میرے اپنے لیے نہ ہو قوم کے لیے ہو۔ تو سلیم شاہ ، میں نے اپنے دل میں کہا کہ لندن جا کر اپنے باپ کے کاروبار میں شامل ہو کر میں بڑا روپیہ کما سکتا ہوں ۔ لیکن یہ روپیہ میرے یا میرے عزیز و اقارب کے کام آئے گا ۔ قوم کے کام نہیں آئے گا ۔

"میں اُس رات سو نہ سکا ۔ اُس بوڑھے کے یہ الفاظ بار بار میرے دماغ میں گونج رہے تھے :

"بیٹا! اگر میری نظر اتنی کمزور نہ ہوتی تو میں بھی کسی طرح وہاں سے نکل آتا"۔

"صُبح میں ایک مختلف آدی بن چکا تھا ۔ پاک بھارت جنگ نے مُجھے ایک مختلف آمی بنا دیا تھا ۔ میں نے ابا جان کو لکھ دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ آنکھوں کا ڈاکٹر بن کر گاؤں گاؤں پھروں اور ایسے مریضوں کا علاج کروں جو خطرے کے وقتِ نظر کمزور ہونے کی وجہ سے اپنی جان نہیں بچا سکتے ۔ ابا جان نے مجھے اس کی اجازت دے دی"۔

یہ کہ کر ڈاکٹر رحمت علی خاموش ہو گئے ۔ ایک منٹ تک خاموشی رہی ۔ پھر ڈاکٹر صاحب بولے "انسان کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر محنت کرے تو وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے ۔ میرے سامنے ایک بڑا مقصد تھا اور وہ مقصد یہ تھا کہ میں اپنی قوم کے بے سہاروں کا سہارا بنوں گا اور چونکہ وہ شخص آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے بے سہارا ہو گیا تھا اِس لیے میں نے اپنی ساری توجُہ ڈاکٹری کی تعلیم پر لگا دی ۔ خُدا نے میری مدد کی اور میں آنکھوں کا ڈاکٹر بن گیا۔ اور اب آنکھوں کے مریضوں کا علاج کر کے اپنا مقصد پورا کر رہا ہوں ۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں تمہارے بُلانے پر کیوں نہیں آیا تھا"۔

سلیم شاہ جو بڑی توجُہ سے ڈاکٹر رحمت علی کی کہانی سُن رہا تھا ، بولا "رحمت علی ، تم جو کُچھ کر رہے ہو ، بالکل دُرست کر رہے ہو ۔ میں شرمندہ ہوں کہ ناراض ہو کر چلا آیا"۔

"سلیم شاہ" ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "یہ سبق مُجھے 1965 کی جنگ نے دیا تھا ۔ آیندہ بھی کبھی ایسا وقت آیا تو میں ان شاء اللہ محاذ پر جا کر اپنے بہادُر سپاہیوں کا علاج کروں گا"۔

"خُدا تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے" سلیم شاہ نے کہا ۔

"آمین"! ڈاکٹر صاحب نے کہا ۔

# ریفل ٹکٹ

سعید لخت

میں اور میری چھوٹی بہن مینا ہر مہینے کے پہلے جُمعے کو چڑیا گھر جاتے تھے ۔ چڑیا گھر ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ جانے سے پہلے امی ہمیشہ مجھے تاکید کرتیں:

"جمی بیٹے ، مینا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھنا ۔ جب سُرخ بتی جل جائے اور گاڑیاں رُک جائیں تب سڑک پار کرنا۔ سڑک پار کرتے وقت دائیں بائیں ضرور دیکھنا ۔ پیسے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھنا اور کسی اجنبی آدمی سے بات مت کرنا۔"

چڑیا گھر میں داخل ہو کر ہم سب سے پہلے طوطوں کے پنجروں کے پاس جاتے ۔ مینا کو بجری گر طوطے بہت پسند تھے ۔ وہ دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہتی اور پھر بڑی حسرت سے کہتی "جمی بھائی جان ، چڑیا گھر والوں سے کہہ کر ایک طوطا مجھے دِلوا دو ۔ ابو تو پتا نہیں کب لائیں گے۔"

اور سچّی بات تو یہ ہے کہ چھوٹی نسل کے یہ خوب صورت طوطے مجھے بھی بہت اچھے لگتے تھے ۔ جب ہم گھر واپس آتے تو تقریباً ہر دفعہ ابو سے طوطوں کی فرمائش کرتے اور وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے "اچھا بیٹے، اس مہینے ٹھہر جاؤ ۔ اگلے مہینے ضرور لا دیں گے۔" لیکن وہ اگلا مہینا ابھی تک نہیں آیا تھا ۔

ایک دن ہم چڑیا گھر گئے تو وہاں کچھ زیادہ ہی چہل پہل تھی ۔ سارا چڑیا گھر رنگ برنگ جھنڈیوں اور غباروں سے سجا ہوا تھا ۔ معلوم ہوا کہ آج بچّوں کا میلا ہے ۔ جب ہم ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر پہنچے تو بکنگ کلرک نے کہا "ٹکٹ کا آدھا حصّہ سنبھال کر رکھنا ۔ چار بجے لاٹری پڑے گی اور پانچ بچّوں کو بجری گر طوطوں کا ایک ایک جوڑا دیا جائے گا۔"

چُوں کہ میں بڑا تھا اس لیے ٹکٹ میں ہی خریدتا تھا۔ میں نے ٹکٹ لیے ، گیٹ کیپر سے اُن کے آدھے حصّے لے کر جیب میں رکھے اور ہم دونوں اندر چلے گئے ۔ آج ہمارا کسی چیز میں دِل نہیں لگ رہا تھا۔ دونوں کی یہی خواہش تھی کہ جلدی سے چار بجیں اور لاٹری پڑے ۔ مینا بار بار کپکپاتی ہوئی آواز میں کہتی "اللہ میاں! میرا نمبر نکل آئے" میں اسے چپ رہنے کے لیے کہتا لیکن اندر سے میرا بھی یہی حال تھا۔ میں بھی ، دل ہی دل میں یہی دُعا مانگ رہا تھا۔

آخر خُدا خُدا کر کے چار بجے ۔ چڑیا گھر کا ایک آدمی ایک اُونچے سے ٹیلے پر چڑھ گیا اور مائکروفون پر چیخ کر بولا "سب بچّے اس ٹیلے کے سامنے جمع ہو جائیں ۔ قُرعہ اندازی ہو گی ۔ پانچ نمبر نکالے جائیں

گے ۔ جن بچّوں کے نمبر نکلیں گے انہیں بجری گر طوطوں کا ایک ایک جوڑا دیا جائے گا۔" پھر اس نے کسی سے کہا "یہ ڈبا یہاں لاؤ۔"
ایک آدمی گتّے کا ایک بڑا سا ڈبا اٹھا کر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اس ڈبّے میں ٹکٹوں کے وہ آدھے حصّے تھے جو گیٹ کیپر نے پھاڑ کر ڈبّے میں ڈالے تھے ۔ اس کے بعد تین آدمی بجری گر طوطوں کے پانچ پنجرے لے کر آئے ۔ تمام بچّوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں ۔
مینا میرا ہاتھ دبا کر بولی "میں وہ سا پنجرا لوں گی ۔ اس میں بہت خوب صورت طوطے ہیں۔"
"زیادہ خوش مت ہو" میں نے آہستہ سے کہا "سینکڑوں بچّے ہیں کیا پتا کس کا نمبر نکلتا ہے۔"
"خاموش! خاموش! اس آدمی نے چلّا کر کہا "مہربانی کر کے خاموش ہو جائیے ۔ اور اب ایک بچّہ میرے پاس اوپر آجائے۔"
بہت سے بچّے ، ایک دوسرے کو دھکّے دیتے ہوئے ، ٹیلے کی طرف بڑھے ۔ ہم ہجوم کے بیچ میں کھڑے تھے ۔ دھکّے کھا کر پیچھے چلے گئے ۔ اس آدمی نے گھبرا کر کہا "صرف ایک بچّہ چاہیئے ۔ باقی تمام بچّے اپنی اپنی جگہ خاموشی سے کھڑے رہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ، اور پھر ایک دُبلی پتلی ، سنہرے بالوں والی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولا "آپ آجائیے۔"
لڑکی دوڑتی ہوئی اوپر چڑھ گئی ۔ تمام بچّوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں ۔ اس آدمی نے لڑکی کی آنکھوں پر رومال باندھا اور اس کا ایک ہاتھ ٹکٹوں کے ڈبّے میں ڈال دیا ۔ پھر اس نے مائکروفون پر کہا "یہ لڑکی پہلا لکی نمبر نکالے گی ۔ آپ سب اپنے اپنے نمبر دیکھئے۔"
مینا نے مجھ سے پوچھا "ہمارے ٹکٹ کہاں ہیں"؟
"میری جیب میں" میں نے جواب دیا۔
"میرا کون سا ہے"؟ اس نے پوچھا۔
"مجھے کیا پتا" میں نے کہا "میں نے تو دونوں ٹکٹ جیب میں رکھ لیے تھے ۔ دونوں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔"
"اوہ"! اس نے کہا "اب یہ کیسے معلوم ہو گا کہ میرا کون سا ہے اور تمہارا کون سا"!
"لو" میں نے جیب میں سے ٹکٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے "تم دونوں لے لو۔"
سنہرے بالوں والی لڑکی کا ہاتھ تیزی سے ڈبّے میں گھوم رہا تھا ۔
چند سیکنڈ بعد اس نے ایک ٹکٹ نکالا ۔ اس آدمی نے ٹکٹ کا نمبر دیکھا اور پھر بولا "خاموش! خاموش! میں نمبر بولتا ہوں ۔ اپنے نمبر غور سے دیکھیے ۔ جس بچے کا یہ نمبر ہو وہ اوپر آجائے ۔ غور سے سُنیئے: پانچ ، تین ، چار ، آٹھ ۔ میں پھر بولتا ہوں: فائیو ، تھری ، فور ، ایٹ ۔"
ہجوم میں سے ایک لڑکا چلّایا "یہ میرا ہے! یہ میرا ہے"! وہ بچّوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا ٹیلے پر چڑھا اور ٹکٹ اس آدمی کو دے دیا۔ وہ نمبر دیکھ کر بولا "مبارک! مبارک! تالیاں"! بچّوں نے تالیاں بجائیں اور لڑکا پنجرا اُٹھا کر نیچے اُتر گیا ۔
لڑکی نے دوبارہ ڈبّے میں ہاتھ ڈالا اور ایک ٹکٹ نکال کر اس آدمی کو دے دیا۔ یہ ایک چھوٹی سی لڑکی کا نمبر تھا۔ وہ خوشی سے اُچھلتی ہوئی آئی اور پنجرا لے کر چلی گئی۔ اس کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا نمبر نکالا گیا۔ ہر نمبر پر تالیاں بجتیں اور جیتنے والا بچّہ پنجرا لے کر چلا جاتا۔
"اب صرف ایک پنجرا رہ گیا ہے" مینا گھٹی ہوئی آواز میں بولی "اور یہ طوطے وہی ہیں جنہیں میں نے پسند کیا تھا"۔
"میں نے بھی انہیں ہی پسند کیا تھا"۔ میں نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔
"خاموش! خاموش!" اس آدمی نے زور سے کہا "اب آخری نمبر سُنیئے: چھ، سات، دو، نو۔ میں پھر بولتا ہوں: سِکس، سیون، ٹو، نائن۔"
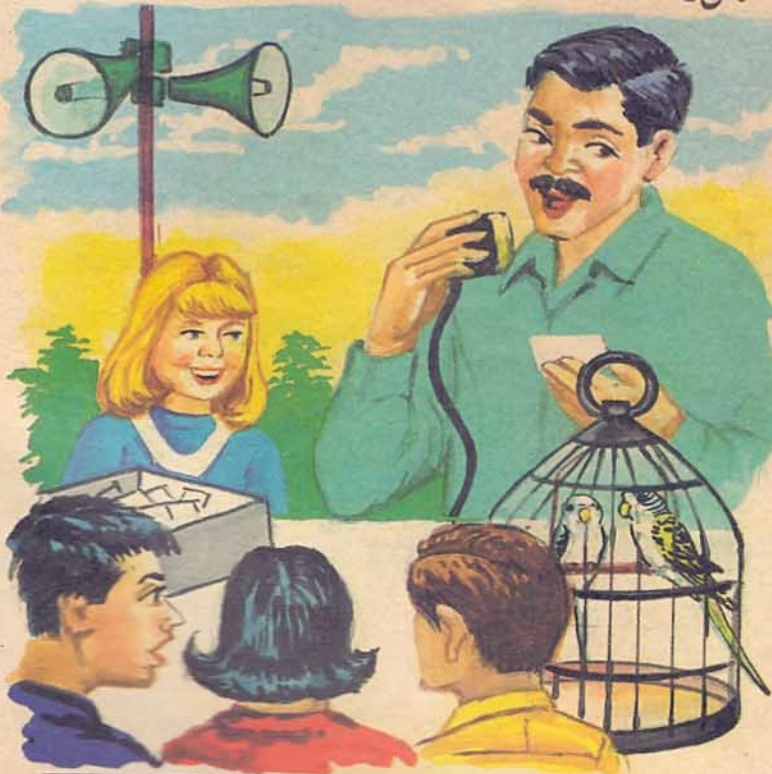
"یہ میرا ہے! یہ میرا ہے!" مینا اُچھل کر بولی۔ لیکن اس کی آواز بچّوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔

"تم کیسے کہتی ہو یہ تمہارا ہے؟" میں بولا "میرا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"بے ایمانی مت کرو" اس نے غُصّے سے کہا "تم نے مجھے دونوں ٹکٹ دے دیے تھے۔ اب یہ میرا ہے"۔

"چھ، سات، دو، نو۔ جس بچّے کا یہ نمبر ہو وہ اُوپر آجائے۔" اس آدمی کی آواز آئی۔

"بے ایمانی تو تم کر رہی ہو" میں نے بھی غصّے سے کہا "کیا اس پر تمہارا نام لکھا ہے؟"

"کیا چھ، سات، دو، نو نمبر کا بچّہ یہاں نہیں ہے؟" اس آدمی نے پوچھا۔

"لکھا ہو یا نہ لکھا ہو۔ یہ نمبر میرا ہے اور طوطے میں لوں گی" مینا بولی۔

"اگر اس نمبر کا بچّہ یہاں موجود نہیں ہے تو ہم دوسرا نمبر نکالیں گے" اس آدمی نے چیخ کر کہا اور لڑکی کا ہاتھ ڈبّے میں ڈال دیا۔

"ٹھہریے! ٹھہریے!" میں پوری طاقت سے چلّایا لیکن بچّوں کے شور میں میری آواز اس آدمی تک نہ پہنچ سکی۔

میں نے مینا کا وہ ہاتھ پکڑا جس میں ٹکٹ تھا اور بولا "ٹکٹ مجھے دے دو"۔ لیکن اس نے ٹکٹ کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ اب ہم نے بچّوں کے ہجوم میں سے گزر کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن کسی نے ہمیں راستہ نہ دیا۔

اتنے میں اس آدمی کی آواز آئی "خاموش ہو جائیے اور غور سے سُنیے۔ آخری نمبر ہے۔۔۔۔ لیکن یہ گڑبڑ کیسی ہے؟ یہ دونوں کیوں لڑ رہے ہیں؟"

"چھ سات، دو، نو میرا نمبر ہے" میں نے حلق پھاڑ کر کہا۔

"یہ میرا نمبر ہے" مینا نے بھی چلّا کر کہا۔

وہ آدمی خود نیچے اُتر کر ہمارے پاس آیا اور بھیڑ کو ایک طرف ہٹاتا ہوا ہمیں اوپر لے گیا۔ لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ٹکٹ مینا کی مُٹھی میں تھا اور اُس کی مُٹھی میری مُٹھی میں تھی۔

اُس آدمی نے قہقہہ لگایا اور بولا "کمال ہے! ایک ٹکٹ کے دو مالک! ارے بھئی، یہ ٹکٹ تم میں سے کس کا ہے؟"

مینا نے سر اُٹھا کر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جنہیں میں کبھی نہ بُھول سکوں گا۔

میں نے دانتوں تلے ہونٹ دبایا اور پھر بولا "یہ ٹکٹ میری بہن کا ہے۔"

مینا کا چہرہ گلاب کی طرح کِھل اُٹھا۔ وہ آدمی طوطوں کا پنجرا اُسے دے کر بولا "مبارک! مبارک! تالیاں۔"

مینا نے پہلے اُس آدمی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی "شکریہ" پھر طوطوں کو دیکھا، اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی "جمی بھائی، یہ میرے نہیں ہیں۔ صرف میرے نہیں ہیں۔ یہ ہمارے ہیں۔ ہم دونوں کے۔"

(مارٹیا۔سی۔شمیچر کی کہانی
"ایڈی اینڈ آئی" سے ماخوذ)

محمد یونس حسرت

# میں نے نیولے پالے

اِس روسی کہانی کا مصنف بورس زتخوف ہر فن مولا تھا ۔ وہ موسیقار بھی تھا اور فوٹو گرافر بھی ۔ بحری جہاز کا کپتان بھی تھا اور ایک ماہر انجینئر بھی ۔ وہ کیمیا دان ، جہاز ساز اور نہ جانے کیا کیا کچھ تھا۔ مگر سُمندر سے اُس کی دِل چسپی اُس کی تمام دِل چسپیوں پر بھاری تھی۔ اُس نے بچّوں کے لیے جو کہانیاں لکھی ہیں اُن میں اُس نے بحری سفر کا حال آسان الفاظ اور دِل چسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اُس کی یہ کہانی اُنھی کہانیوں میں سے ایک ہے جسے آپ کے پسندیدہ ادیب محمد یونس حسرت نے اُردو میں منتقل کیا ہے ۔

---

مجھے نیولا پالنے کا بچپن ہی سے شوق تھا ۔ قسمت کی خوبی دیکھیے کہ میرا یہ شوق اُس وقت پورا ہوا جب ہمارا جہاز مُلکوں مُلکوں کا سفر کرتا ہوا بحرِ ہند کے ایک جزیرہ سیلون (سری لنکا) کے ساحل پر لنگر انداز ہوا ۔ میں ابھی جہاز سے اُترنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بوڑھا جہاز پر آیا ۔ ایک شور سا مچ گیا اور سارے جہازی اس بوڑھے کے گرد جمع ہو گئے ۔ اِس شور کے درمیان "نیولے" کا لفظ میرے کان میں پڑا تو میں دوسرے جہازیوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اُس بوڑھے تک جا پہنچا ۔ بوڑھے کے ہاتھ میں ایک پنجرا تھا اور اُس پنجرے میں ایک نہیں ، دو نیولے تھے ۔ میں نے وہ دونوں نیولے پنجرے سمیت منہ مانگی قیمت پر خرید لیے ۔ میں اتنا خوش تھا کہ مجھے یہ پوچھنے کا بھی خیال نہ رہا کہ یہ نیولے پالتو ہیں یا جنگلی ، ان کی خوراک کیا ہے اور یہ کاٹتے تو نہیں ۔ جب میرے ہوش ذرا ٹھکانے آئے تو اُس وقت وہ بوڑھا جا چکا تھا ۔

میں نیولوں کا پنجرا تھامے اپنے کیبن میں آیا اور ساری باتیں خود معلوم کرنے کا فیصلہ کیا ۔ میں نے پنجرے کی سلاخوں میں سے اپنی اُنگلی اندر ڈالی تو ایک نیولے کے نوکیلے ناخنوں والا چھوٹا سے پنجہ میری اُنگلی کی طرف بڑھا ۔ مگر اُسے کاٹنے کی بجائے اُس سے کھیلنے لگا ۔ دوسرا نیولا پنجرے کے ایک کونے میں بیٹھا میری طرف شک بھری نظروں سے دیکھتا رہا ۔

میں نے اُس نیولے کو پیار کرنے کے ارادے سے پنجرے کا دروازہ ذرا سا کھولا تو وہ لپک کر باہر آگیا اور کیبن کے فرش پر اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ اِدھر اُدھر دوڑنے اور کونے کھدروں میں سونگھنے کے بعد وہ میرے اِرد گرد چکر کاٹنے لگا۔ میں اُسے پکڑنے کے لئے جُھکا تو وہ اُچھل کر میری کلائی سے ہوتا ہوا کندھے پر آگیا، اور قلابازی لگا کر اپنے پچھلے پنجوں پر سیدھا کھڑا ہو گیا ۔ دوسرے ہی لمحے وہ اُچھل کر میرے گھٹنے پر آگیا ۔ وہاں اُس نے پہلے تو اپنی لمبی سی دُم ہوا میں بلند کی اور پھر اپنا سر پچھلے پنجوں میں چُھپا لیا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی بازی گر کرتب دکھا رہا ہو ۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے اپنا مالک

سمجھتے ہوئے مجھ سے مانوس ہوگیا ہے ۔ عین اسی لمحے میرے کیبن کے دروازے پر دستک ہوئی ۔ ہمیں وہ کام کرنا تھا جس کی خاطر ہمارا جہاز سیلون کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تھا ۔ میں نے جلدی سے اس نیولے کو پنجرے میں بند کیا اور کیبن سے باہر نکل آیا۔

ہمیں تقریباً پندرہ بھاری بھرکم درختوں کے لٹھے جہاز پر لدوانے تھے۔ اُن کی جڑیں اور شاخیں کاٹ دی گئی تھیں ۔ یہ لٹھے اندر سے کھوکھلے اور خاصے موٹے تھے۔ انہیں سیدھا جنگل سے جہاز پر لایا گیا تھا اس لئے وہ چھال سمیت تھے۔ ان کے کھوکھلے حصے جو گلابی ، سرخ یا گہرے سیاہ تھے، دیکھنے میں خاصے خوب صورت تھے۔ ہم نے ان کو جہاز پر لدوایا اور مضبوط رسّوں کے ساتھ عرشے سے باندھ دیا ۔

کام ختم ہوا تو مجھے اپنے نیولوں کے کھانے پینے کی فکر ہوئی ۔ مجھے نیولوں کی خوراک کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا اور میرے ساتھی بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے ۔ میں نے سوچا کہ دو چار چیزیں لے جانی چاہئیں ۔ اپنے آپ پتا چل جائے گا کہ نیولوں کو کون سی چیز چاہیے ۔

پنجرے کا دروازہ کھلتے ہیں دونوں نیولے ایک ساتھ باہر نکلے اور گوشت پر جھپٹ پڑے ۔ تیز نوکیلے دانتوں سے گوشت کا صفایا کرنے کے بعد وہ دودھ کے پیالے کی طرف بڑھے اور شڑپ شڑپ کرکے اُس پیالے کو بھی منٹوں میں خالی کر دیا ۔ روٹی کی طرف انہوں نے نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا مگر ایک ایک کیلا لے کر الگ الگ کونوں میں بیٹھ گئے ۔ تھوڑی دیر بعد کیبن میں صرف کیلوں کے چھلکے باقی رہ گئے ۔ اُن کا گودا نیولوں کے پیٹ میں پہنچ چکا تھا ۔

اس کے بعد سے میرا یہ معمول ہوگیا کہ ڈھیر سارے کیلے ملا کر انہیں کیبن کی چھت سے لٹکا دیتا اور دونوں نیولے انہیں آرام سے کھاتے رہتے ۔

ایک روز اُس نیولے کو جو آتے ہی مجھ سے مانوس ہوگیا تھا میں پنجرے سے نکال کر جہاز کے عرشے پر لے آیا ۔ عرشے پر آتے ہی وہ ادھر اُدھر بھاگنے دوڑنے اور کونوں کُھدروں کو سونگھنے لگا ۔ ہم نے چوہوں کا صفایا کرنے کے لئے ایک موٹا تازہ بِلّا پال رکھا تھا۔ یہ بِلّا اپنے آپ کو جہاز کے عرشے کا مالک سمجھتا تھا۔ اس کے گلے میں پیتل کا ایک پٹا پڑا ہوا تھا اور وہ یہ پٹا گلے میں ڈالے عرشے پر یوں شان سے گھومتا تھا جیسے کوئی بادشاہ اپنے محل میں مٹر گشت کر رہا ہو ۔

اُس روز بھی بِلّا جہاز کے باورچی خانے میں اپنا پیٹ بھرنے کے بعد مٹر گوشت کے لئے جہاز کے عرشے پر آیا تو اس کی نظر نیولے پر پڑی جو لوہے کے ایک پائپ کے منہ کے قریب بیٹھا تھا۔ بِلّا دبے پاؤں آگے بڑھا اور پائپ کے اوپر بیٹھ گیا تاکہ مناسب وقت پر نیولے پر جھپٹ سکے ۔

مجھے فوراً احساس ہُوا کہ کیا ہونے والا ہے ۔ مگر اِس سے پہلے کہ میں نیولے تک پہنچتا ، وہ کچھ ہوگیا جس کا مجھے گمان تک نہ تھا۔ بِلّے کی آمد سے باخبر ہو کر نیولے نے پہلے اپنا سر پچھلے پنجوں کے درمیان کیا، پھر دُم سیدھی کر کے غُراہٹ کی ایسی خوفناک آواز نکالی کہ پائپ کے اوپر بیٹھا ہوا ہٹا کٹا بِلّا فوراً دُم دبا کر وہاں سے بھاگ گیا۔

اِس کے بعد ہم نے عرشے پر، نیولے کی موجودگی میں ، اُس بِلّے کو کبھی نہیں دیکھا ۔ جہازیوں کے بلانے اور پُس پُس کرنے پر بھی وہ باورچی خانے سے باہر نہیں آتا تھا۔ صرف رات کے وقت ہی جب نیولے پنجرے میں بند ہوتے، وہ ٹہلنے کے لئے عرشے پر آتا۔

ایک رات جہازیوں کے شور سے میری آنکھ کُھل گئی، میں کیبن سے نکل کر عرشے پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ ایک پہرے دار پر ایک

سانپ نے حملہ کیا تھا۔ یہ سانپ درختوں کے اُن کھوکھلے لٹھوں میں سے نکلا تھا جو عرشے پر لدے ہوئے تھے۔ پہرے دار نے بڑی مشکل سے بھاگ کر جان بچائی۔

۔ سانپ دوبارہ درختوں کے کھوکھلے لٹھوں میں جا چھپا تھا اور اب سارے جہازی حیرانی پریشانی اور خوف کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ پہرے دار کے بیان کے مطابق سانپ کوئی ہاتھ بھر موٹا اور دس بارہ ہاتھ لمبا تھا۔ وہ درختوں کے ان کھوکھلے تنوں سے نکل کر کسی بھی کیبن میں اور کسی بھی جہازی کے بستر میں گھس سکتا تھا۔

میں لپک کر واپس کیبن میں گیا اور وہاں سے نیولوں کا پنجرا اٹھا لایا۔

جہازیوں نے عرشے پر روشنی کر دی اور میں نے لٹھوں کے قریب جا کر پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی دونوں نیولے آگے پیچھے پنجرے سے نکلے، ایک لمحے کے لئے ذرا رُک کر اِدھر اُدھر سونگھا اور پھر ان بھاری بھرکم لٹھوں میں گھس گئے۔

ہم سب چُپ چاپ اور دم سادھے کھڑے تھے۔ وہی پہرے دار جس پر سانپ نے حملہ کیا تھا، ایک کلہاڑا لے آیا تھا۔ خاصی دیر بعد درختوں کے لٹھوں سے ایک دُم باہر کو سرکتی نظر آئی۔ ایک شخص چلّایا۔ وہ دیکھو! وہ رہی دُم!

پہرے دار آگے بڑھ کر کلہاڑے سے وار کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ دُم سانپ کی نہیں، نیولے کی تھی۔ دُم کبھی باہر آتی اور کبھی اندر چلی جاتی پھر دو ننھے ننھے پنجے نمودار ہوئے۔ نیولا لٹھے پر اپنے پنجے جمانے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی چیز اُسے اندر کی طرف کھینچ رہی تھی۔

آخر کار نیولے نے بل کھاتے ہوئے لٹھے پر اپنے پنجے مضبوطی سے جمائے اور ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو پیچھے کی طرف کھینچا۔ یوں وہ سانپ کی دم بھی باہر کی طرف چلی آئی جسے نیولے نے اپنے نوکیلے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔

سانپ کی دُم زور سے ہلی اُس نے نیولے کو ہوا میں اُچھال دِیا اور وہ عرشے سے جا ٹکرایا۔ مگر یہ فوراً ہی اُٹھا اور سانپ کی دم کو پھر اپنے نوکیلے دانتوں میں دبا لیا اور اسے باہر کی طرف کھینچنے لگا۔ سانپ سمٹ کر نیولے کو دوبارہ لٹھوں کے اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگا مگر نیولے نے لٹھے پر اپنے پنجے مضبوطی سے جما لیے تھے۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانپ کو باہر نکالنے لگا۔ سانپ اگرچہ ہاتھ بھر موٹا تو نہیں تھا مگر اُس کی موٹائی تین چار اُنگل سے کم بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی دُم کو بار بار کوڑے کی طرح عرشے پر مارتا تھا اور اس کے ساتھ نیولے کو بھی اِدھر اُدھر اچھال دیتا تھا۔ مگر نیولے نے اپنے دانت سانپ کی دُم میں مضبوطی سے گاڑ رکھے تھے۔

اب ہم سب اِس انتظار میں تھے کہ دیکھیں سانپ کا سر کب اور کس حال میں بر آمد ہوتا ہے؟ مگر کافی اِنتظار کے بعد جب سانپ کی بجائے دوسرے نیولے کا سر باہر آیا تو ہم حیران رہ گئے۔ لیکن جلد ہی ہماری یہ حیرانی بھی دور ہو گئی۔ دوسرے نیولے نے سانپ کی گردن میں اپنے دانت گاڑ رکھے تھے۔ سانپ بل کھا کھا کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں دونوں نیولوں کو اِدھر اُدھر پٹخنیاں بھی دے رہا تھا مگر نیولے جونکوں کی طرح اُس سے چمٹے ہوئے تھے۔

اب تک ہم خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھتے آئے تھے۔ سانپ کا سر باہر آیا اور اس نے اپنے آپ کو نیولوں کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی تو کئی ایک جہازیوں پر بہادری کا دورہ پڑ گیا اور جو کچھ جس کے ہاتھ لگا، لے کر سانپ پر پل پڑے۔

مجھے ڈر تھا کہ جہازیوں کی اِس بہادری سے نیولوں کے چوٹ نہ لگ جائے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس نیولے کو الگ کر لیا جِس نے سانپ کی دُم پکڑ رکھی تھی۔ میری اس حرکت پر وہ اتنا غضب ناک ہوا کہ میری اُنگلی پر کاٹ کھایا۔ دوسرے نیولے کو ایک اور جہازی نے بڑی مشکل سے سانپ کی گردن سے الگ کیا۔ میں نے اُنہیں دوبارہ پنجرے میں ڈالا تو وہ یوں اُس کی سلاخوں سے ٹکریں مارنے لگے جیسے پنجرے کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ میں نے انہیں کیبن میں لا کر گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا دیا مگر اُنہوں نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

بہرحال اس واقعے کے بعد دونوں نیولے تمام جہازیوں کے لاڈلے بن گئے اور ہر کوئی اپنے کھانے کے بچے کھچے حصّے سے ان کی تواضع کرنے لگا۔ جب ہمارا سفر ختم ہوا تو دونوں نیولے نہ صرف مجھ سے بلکہ سارے جہازیوں سے پورے طور پر مانوس ہو چکے تھے۔ سفر کے اختتام پر میں ان دونوں کو اپنے گھر لے آیا ——— اور انہوں نے جلد ہی میرے خاندان کے تمام افراد کو اسی طرح اپنا گرویدہ بنا لیا جس طرح تمام جہازیوں کو بنا لیا تھا۔

# اُف یہ آگ

رضوانہ سیّد علی

"نُزہت، سارہ، چلو، آلو بُھون کر کھائیں" سلیم نے بہنوں کے کمرے میں آکر کہا۔

سارہ تو تھی ہی سدا کی چٹوری، اُچھل پڑی، البتہ نُزہت کچھ ڈر سی گئی اور کہنے لگی "نہیں، بھائی۔ امّی کو پتا چل گیا تو خفا ہوں گی۔"

"پتا کیسے چلے گا؟" سارہ نے فوراً ٹانگ اڑائی۔ اُسے خطرہ تھا کہ سلیم کہیں ارادہ مُلتوی نہ کر دے "ہم لوگ پچھلے صحن میں چلتے ہیں۔ امّی تو سو رہی ہیں۔ آپا نے اپنے کمرے میں ڈیک لگا رکھا ہے اور کشیدہ کاری میں مصروف ہیں۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا"۔

بُھنے آلو نُزہت کو بھی بہت پسند تھے۔ لٰہذا وہ تیار ہو ہی گئی۔ تینوں چپکے چپکے باورچی خانے میں داخل ہوئے اور بہت سے آلو اور ماچس اُٹھا کر پچھلے صحن کی طرف چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ چھت پر چڑھ کر بُھنے ہوئے آلو نمک مرچ لگا لگا کر مزے سے کھا رہے تھے۔

آلو کھا کر نُزہت تو رسالہ پڑھنے میں مصروف ہو گئی، سارہ کو کچھ غنودگی سی محسوس ہوئی اور وہ لیٹ گئی۔ سلیم اپنا بیٹ اُٹھا کر ہارون کے ساتھ کھیلنے نکل گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک دم کُہرام سا مچ گیا "آگ! آگ!" نُزہت اور سارہ ہڑبڑا کر باہر بھاگیں، پچھلے صحن کے کونے میں بنا ہوا مرغیوں کا ڈربا دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔ پُرانی خشک لکڑیوں سے دُھوئیں کے گاڑھے گاڑھے مرغولے اُٹھ اُٹھ کر پورے صحن پر چھا رہے تھے اور گھر میں بھی گُھسے چلے آ رہے تھے۔ امّی تو بوکھلائی سی کھڑی تھیں البتّہ آپا، بھائی جان اور رحیمن بُوا بھاگ بھاگ کر پانی کی بالٹیاں ڈربے پر اُنڈیل رہے تھے۔ ڈربے کے آس پاس کوئی آگ پکڑنے والی چیز نہ تھی۔ اِس لئے مزید آگ نہ بھڑکی، البتہ ڈربا جل کر خاک ہو گیا، نُزہت اور سیما چور بنی کھڑی تھیں۔ انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ آگ لگی کیسے وہ تو آگ بُجھا کر اُوپر گئے تھے۔ نادان لڑکیوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ راکھ میں دبی ہوئی ایک چنگاری بھی بسا اوقات بھرے گھر کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ بظاہر تو آگ بُجھ چکی تھی لیکن راکھ کے اندر کئی چنگاریاں چھپی ہوئی تھیں جنہیں ہوا نے بھڑکا دیا اور وہ اُڑ کر ڈربے پر جا گریں۔ یوں اس میں آگ لگ گئی۔

آگ بجھی تو سب کے حواس ٹھکانے لگے اور اب تحقیقات شروع ہو گئی کہ آگ کیوں کر لگی جلد ہی مُجرم دریافت کر لئے گئے اور رات کو یہ مقدمہ ابا جان کی عدالت میں پیش ہوا۔ بچّوں کا خوف سے بُرا حال تھا۔ ان کی حالت دیکھتے ہوئے ابا جان نے اُنہیں معاف کر دیا اور مزید عبرت دلانے کیلئے ایک واقعہ بھی سُنایا جو کچھ یُوں تھا۔ اُنہوں نے کہا:

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری عمر کوئی سات برس ہو گی۔ اُن دنوں ہمارے گھر کے قریب جانوروں کی منڈی لگتی تھی۔ ایک بہت بڑے باڑے میں سینکڑوں مویشی بندھے رہتے تھے۔ باڑا لکڑی کا تھا اور اُس پر کھپریل پڑی ہوئی تھی۔ اُپلے تھاپنے والی عورتیں مویشیوں کا گوبر جمع کرتیں اور باڑے کے چاروں طرف اُپلے تھاپ دیتی۔

"ابا جان، یہ اُپلے کیا ہوتے ہیں؟" ننھے گگّو نے حیرت سے پُوچھا۔

امّی جان ہنس پڑیں "ہاں بھئی یہ گیس کا زمانہ ہے۔ آج کے بچّوں کو بھلا اُپلوں کا کیا پتا۔"

"میں بتاتا ہوں، اُپلے کسے کہتے ہیں" ابا جان بولے۔

"ٹھہریے ابا جان۔ پہلے مجھے ایک لطیفہ سُنا لینے دیجئے" بھائی جان نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ سب اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بھائی جان بولے:

"ایک امریکی پاکستان آیا۔ کئی دن یہاں گھوم پھر کر واپس جانے لگا تو اس کے پاکستانی دوست نے پوچھا "کہو، دوست ہمارا مُلک کیسا لگا؟"

"بہت اچھا" امریکی بولا "مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیا؟" پاکستانی نے پوچھا "گائے گوبر کرنے دیواروں پر کیسے چڑھ جاتی ہے؟" امریکی نے حیرت سے کہا۔

"کیا مطلب"؟ پاکستانی حیران ہُوا۔

"بھئی، میں کئی دیہاتوں میں گیا۔ وہاں دیکھا کہ دیواروں پر اُوپر سے نیچے تک گوبر پڑا ہے۔"

"جب میں خالہ جان کے گاؤں گیا تھا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی مگر میں نے کسی سے پوچھا نہیں تھا" اب تو سب کا ہنسی سے بُرا حال ہو گیا۔

ابا جان بولے "پہلے یہ سمجھ لو کہ اُپلے کسے کہتے ہیں، پھر دیواروں پر گوبر کی وجہ تُمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ گائے دیواروں پر نہیں چڑھتی بلکہ اس کے گوبر کو دیہاتی عورتیں گول گول بنا کر دیواروں پر چپکا دیتی ہیں۔ خُشک ہونے پر یہ گوبر ایندھن کے کام آتا ہے اور اس طرح غریبوں کا چُولہا جَلتا ہے اسی خُشک گوبر کو اُپلے کہتے ہیں۔

"ہاں تو جس باڑے کا میں ذکر کر رہا تھا، اُس کے چاروں طرف بھی اُپلے تُھپے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ بہار کا موسم تھا۔ کھیتوں میں ہرے چنے پکنے کو تیار کھڑے تھے۔ ہرے چنوں کی اپنی ہی لذّت ہوتی ہے۔ اس کا سالن بنایا جاتا ہے، پلاؤ پکتا ہے اور ہولوں کا تو کہنا ہی کیا۔ ہرے چنوں کو ٹہنیوں سمیت خشک کر لیتے ہیں پھر ٹہنیوں کو جلا دیا جاتا ہے۔ جب ٹہنیاں جل کر خاک ہو جاتی ہیں تو ہولے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جاتے ہیں۔ ہاتھ اور منہ راکھ سے کالے ہو جاتے ہیں مگر چنوں کی لذّت سے جی نہیں بھرتا۔

"بس اِسی موسم میں ایک دن چند لڑکوں نے کھیت سے ہرے چنے توڑے اور باڑے کی پچھلی طرف آ کر انہیں بُھوننے لگے۔ ہوا اُس روز خوب تیز چل رہی تھی۔ شُعلے بلند ہوئے تو اُپلوں نے آگ پکڑ لی۔ بس پھر کیا تھا آگ یوں بڑھنے لگی جیسے دریا کا پانی سیلاب میں چاروں طرف پھیلتا ہے۔ لڑکے تو گھبرا کر بھاگ گئے۔ باڑا آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ باڑے کے مالک اور آدمی باڑے کے ایک کونے میں بیٹھے مزے سے حُقّہ گڑگڑا رہے تھے۔ اُنہیں جب تک خبر ہوئی مویشی آگ میں گِھر چکے تھے۔ آخر کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد آگ بُجھی لیکن کسی ایک جانور کو بھی بچایا نہ جا سکا۔ سب جل بُھن کر کباب ہو گئے۔ آگ بُجھی تو جانوروں کی لاشیں یوں لگتی تھیں جیسے کوئلے سے بنی ہوئی ہوں۔ یُوں چند نادان لڑکوں کی غفلت نے بیچارے بے زبانوں کو موت کی نیند سُلا دیا اور بیسیوں لوگوں کا بے اندازہ نقصان بھی کروا دیا۔

نُزہت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سلیم اور سارہ بھی پشیمان کھڑے تھے. تینوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ نہ تو آگ سے کھیلیں گے اور نہ کبھی کسی کام میں بے پروائی کریں گے۔

"شاباش! شاباش!" ابا جان نے اُن کی پیٹھ تھپکی "انسان وُہی ہے جو غلطیوں سے سبق حاصل کرے اور انہیں دوبارہ کبھی نہ دوہرائے۔"

انگوٹھی کہاں گئی؟

# اور اجمیر پر اسلامی پرچم لہرانے لگا!

اے حمید

5

فاران کی انگوٹھی ندی میں گر چکی تھی۔

وہ انگوٹھی ہر حالت میں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ندی میں چھلانگ لگا دی اور غوطہ لگا کر ندی کی تہ میں انگوٹھی ڈھونڈنے لگا۔ ندی کا پانی گدلا تھا۔ اسے پانی میں ہر شے دُھندلی دُھندلی نظر آتی تھی۔ اس نے پانی کے نیچے سانس روکا ہوا تھا۔ جب وہ سانس مزید نہ روک سکا تو اس نے سر پانی سے باہر نکال لیا۔

سر باہر نکال کر کیا دیکھتا ہے کہ نہ وہ جنگل ہے نہ وہ باغ ہے، نہ وہ ندی ہے۔ وہ ایک دریا میں کمر تک پانی میں ڈوبا کھڑا ہے اور دریا کے کنارے دور تک کھیت اور کھجور کے درخت ہیں۔ وہ حیران ہوا کہ ایک پل میں کہاں سے کہاں آگیا! وہ دریا سے باہر نکلا اور کھیتوں میں چل پڑا۔ اب اسے شہر کی فصیل اور قلعے کے بُرج نظر آئے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ کون سا شہر ہے اور کون سا زمانہ ہے۔ اتنا اسے احساس تھا کہ وہ یا تو تاریخ کے پیچھے کے زمانے میں یا آگے کے کسی عہد میں آگیا ہے۔

گُلابی موسم تھا۔ خوش گوار دُھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اسے شہر کی فصیل پر اسلامی پرچم لہراتا نظر آیا تو اسے خوشی ہوئی کہ وہ کسی مسلمان حاکم کے شہر میں داخل ہو رہا ہے۔ ابھی شہر کا دروازہ کچھ فاصلے پر تھا کہ ایک درویش صورت بزرگ کھجور کے درختوں میں سے نکل کر اس کی طرف آئے۔ فاران اپنے دھیان میں چلتا گیا۔ بزرگ نے اس کا نام لے کر اسے آواز دی تو وہ رک گیا۔ بزرگ کی صورت نورانی تھی اور وہ فاران کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ فاران نے بزرگ کو سلام کیا اور پوچھا "آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

بزرگ نے کہا "مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کہاں جاؤ گے!"

فاران سمجھ گیا کہ اِن بزرگ کو اس کے تاریخی اور پر اسرار سفر کا سارا حال معلوم ہے۔ جب فاران نے ان سے اپنی انگوٹھی کا ذکر کیا جو ندی میں گم ہو گئی تھی، تو انہوں نے کہا "وہ انگوٹھی وقت کے پاس تمہاری امانت ہے اور وقت آنے پر تمہیں مل جائے گی"۔

فاران نے شہر کی فصیل کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "محترم، یہ کون سا شہر ہے اور میں کس زمانے میں آگیا ہوں؟"

بزرگ نے جواب دیا "فاران، تم پانچ سو اٹھاسی ہجری کے زمانے میں ہو اور یہ شہر لاہور ہے"۔

فاران نے حیرت اور تعجّب سے لاہور کے اونچے محرابی دروازے کو دیکھا۔ پھر ان لوگوں کو دیکھا جو پرانے زمانے کے لمبے لمبے فرغل اور لبادے پہنے شہر میں آجا رہے تھے۔ کوئی گھوڑے پر سوار تھا تو کوئی اونٹ پر سامان لادے جا رہا تھا۔ شہر کے دروازے پر دونوں جانب کھڑے فوجی بھی دکھائی دیئے جنہوں نے لوہے کے خود پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں نیزے پکڑے ہوئے تھے۔ فاران نے بزرگ سے پوچھا:

"محترم، اگر میں چھٹی صدی ہجری کے لاہور شہر کے باہر کھڑا ہوں تو یہ فرمائیے کہ اس شہر پر کس کی حکومت ہے؟"

بزرگ نے کہا "تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ مشہور مسلمان سپہ سالار اور مجاہد شہاب الدین محمد غوری کا زمانہ ہے اور لاہور شہر پر اس کا ایک گورنر حکومت کر رہا ہے"۔

فاران نے کہا "میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ اسلامی تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا شہاب الدین محمد غوری کے زمانے میں آ گیا ہوں"۔ بزرگ نے کہا "تم خوش قسمت ہو کہ اس وقت مسلمان بادشاہ شہاب الدین محمد غوری لاہور کے قلعے میں موجود ہے اور اس کا شاہی لشکر شہر کی فصیل کی مغربی جانب خیمہ زن ہے"۔

فاران بڑا خوش ہوا ۔ کہنے لگا "محترم، کیا میں اس عظیم مسلمان بادشاہ اور بہادر سپہ سالار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں؟"

بزرگ نے کہا "چونکہ تم پاکستان سے اس مہم پر نکلے ہو کہ اپنی آنکھوں سے اسلام کے عظیم بادشاہوں اور غیور جیالے مسلمان سپہ سالاروں کو کفر کے خلاف جہاد کرتے دیکھو، اس لیے میں تمہیں شہنشاہ شہاب الدین محمد غوری کی خدمت میں پہنچا دوں گا"۔

فاران نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "محترم، میں کس حیثیت میں اس عظیم مسلمان سپہ سالار کی خدمت میں جاؤں گا"۔

بزرگ نے کہا "شہر میں داخل ہو جاؤ ۔ کچھ اندر جانے کے بعد تمہیں بائیں جانب ایک عالی شان حویلی ملے گی ۔ اس حویلی میں شہاب الدین محمد غوری کا مُعتمد خاص امیر رکن الدین حمزہ رہتا ہے ۔ اس سے جا کر کہنا کہ مجھے فقیر شمس الدین نے بھیجا ہے ۔ یہ میرا نام ہے ۔ پھر تم اس کے آگے اپنی خواہش کا اظہار کرنا ۔ وہ تمہاری خواہش پوری کر دے گا ۔ اب جاؤ، اللہ تمہارا نگہبان ہو"۔ یہ کہہ کر بزرگ جدھر سے آئے تھے اُدھر چل دیے ۔

فاران بھی شہر کے دروازے میں سے گزر کر لاہور شہر کے اندر آ گیا ۔ یہ لاہور شہر آج کے اُس لاہور شہر سے بالکل مختلف تھا جس کو چھوڑ کر وہ تاریخ کے قدیم زمانے میں آ گیا تھا ۔ آج کے لاہور شہر میں رکشے، ویگنیں اور بسیں چلتی ہیں ۔ ٹیلی ویژن اسٹیشن ہے ۔ ہوائی اڈا ہے اور دفتر میں کمپیوٹر لگے ہیں ۔ مگر اس چھٹی صدی ہجری کے لاہور میں سڑکوں پر گھوڑے، اونٹ اور بیل گاڑیاں چلتی تھیں ۔ اگرچہ مکان چار چار پانچ پانچ منزلہ تھے اور زیادہ تر لکڑی کے بنے ہوئے تھے ۔ سڑکیں صاف ستھری تھیں ۔ لوگ بڑی شائستگی اور تہذیب سے ایک دوسرے سے بات کرتے تھے اور ملتے اور جدا ہوتے وقت السلامُ و علیکم کہتے تھے ۔

فاران کو بائیں طرف کچھ فاصلے پر ایک عالی شان حویلی نظر آئی جس کے دروازے پر پہرا لگا تھا ۔ فاران قریب گیا ۔ دو حبشی غلام پہرا دے رہے تھے ۔ فاران نے کہا "مجھے محترم امیر رکن الدین حمزہ سے ملنا ہے"۔

حبشی غلام نے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو تو فاران نے کہا "محترم امیر کو جا کر پیغام دو کہ مجھے فقیر شمس الدین نے ان کے پاس بھیجا ہے"۔ پیغام کا پہنچنا تھا کہ امیر رکن الدین خود چل کر حویلی کی ڈیوڑھی میں آ گیا ۔ اس نے اپنے سامنے ایک خوش شکل اور صحت مند نوجوان کو دیکھا تو اس سے ہاتھ ملایا ۔ فاران نے بڑے ادب سے سلام کیا ۔ رکن الدین حمزہ فاران کو اپنے ساتھ دیوان خانے میں لے گیا جہاں قیمتی قالین بچھے تھے ۔ امیر نے فاران کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور پوچھا کہ یہاں کیسے آنا ہوا ۔ کوئی حاجت ہو تو بے جھجک کہو ۔ میں اسے ان شاء اللہ پورا کرنے کی کوشش کروں گا ۔ فاران نے کہا "محترم فقیر شمس الدین صاحب نے مجھے آپ کی خدمت میں اس لیے بھیجا ہے کہ مجھے بادشاہ اور عظیم سپہ سالار شہاب الدین محمد غوری کو دیکھنے کا شوق ہے"۔

امیر رکن الدین نے کچھ سوچ کر کہا "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے ۔ لیکن فقیر شمس الدین میرے مرشد ہیں ۔ میں ان کی بات کبھی نہیں ٹال سکتا ۔ غور سے سنو! میں آج شام اجمیر اور دہلی کے راجا پرتھوی راج چوہان کے نام بادشاہ کا ایک ایسا خط لے کر راجا کے دارالسلطنت اجمیر جا رہا ہوں جس میں بادشاہ شہاب الدین نے راجا کو اسلام کی دعوت دی ہے اور اسے کہا ہے کہ یا تو اسلام قبول کر کے اپنی عاقبت کو سنوار لو یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ"۔

فاران کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا ۔ اس نے کہا "میں کس حیثیت سے آپ کے ساتھ سفر کروں گا ، محترم"؟

امیر رکن الدین بولا "تم میرے ملازم خاص ہو گے اور تمہارا نام وہی ہو گا جواب ہے ۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

فاران نے اپنا نام بتایا تو امیر رکن الدین بولا "جلدی سے کپڑے بدل لو ۔ میں تمہیں نئے کپڑے دیتا ہوں"۔

تھوڑی دیر بعد فاران کپڑے بدل کر امیر کے ساتھ شاہی محل میں جانے کے لیے بالکل تیار تھا ۔ امیر رکن الدین حمزہ نے فاران کو ساتھ لیا اور شاہی محل پہنچ گیا ۔ دیوانِ خاص میں بادشاہ شہاب الدین محمد غوری تختِ شاہی پر بیٹھا تھا ۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر شاہانہ جلال تھا ۔ یہ وہ بادشاہ نہیں تھا جو تخت پر ریشم و کمخواب کا شاہی لباس پہن کر بیٹھتے ہیں ۔ یہ مردِ مجاہد مسلمان بادشاہ تھا ۔ وہ جنگی لباس میں تھا ۔ سر پر فولاد کا خود تھا جس کی فولادی جھالر پیچھے گردن سے نیچے تک لٹک رہی تھی ۔ چمڑے کا سینہ بند ، فولاد کے بازو بند ، گھٹنوں پر رکھی ہوئی ہلالی تلوار جس کے دستے پر زمرد جڑے ہوئے تھے تاکہ تلوار چلاتے وقت ہاتھ پھسل نہ جائے ۔ فولادی خود کے اوپر ہلال بنا ہوا تھا ۔ تخت کے دونوں جانب امیر وزیر ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے تھے ۔

امیر رکن الدین حمزہ آگے بڑھ کر تعظیم بجا لایا ۔ فاران پیچھے امیروں کی قطار میں کھڑا تھا ۔ شہاب الدین غوری نے رکن الدین کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا "رکن الدین ، تم ہماری طرف سے پیغام لے کر اجمیر کے راجا پرتھوی راج چوہان کے پاس جا رہے ہو ۔ اس سے کہنا کہ ہم اسے اسلام میں داخل ہونے کا سنہری موقع دیتے ہیں ۔ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اپنی عاقبت کو سنوارے ، ورنہ ہمارے ساتھ جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جائے"۔

امیر رکن الدین نے ادب سے کہا "شاہِ معظم ، بندہ آپ کا پیغام راجا تک اسی طرح پہنچائے گا"۔

شہاب الدین غوری نے دبیرُالملک کی طرف دیکھا ۔ دبیرُالملک نے ایک چمڑے کا تھیلا بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا ۔ بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے وہ تھیلا رکن الدین کو دیا اور کہا اُس میں راجا کے نام وہ خط ہے جس میں ہم نے اسے امن اور سلامتی کی طرف بُلایا ہے ۔ ہم تمہاری واپسی کا انتظار کریں گے"۔

امیر رکن الدین نے خط کا تھیلا لے لیا اور عرض کی "خاکسار ہوا کے ساتھ سفر کرتا ہوا جائے گا"۔

فاران کی نظر شہاب الدین محمد غوری کے پُر جلال چہرے سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹتی تھی ۔ محمود غزنوی کے بعد اب اسے اس مسلمان بادشاہ کے دیدار کا شرف حاصل ہو رہا تھا جس نے برِصغیر ہندوستان میں کفر کے اندھیروں کو اسلام کی روشنی سے نورانی کیا ۔ وہ امیر الدین کے ساتھ ہی شاہی محل سے باہر آ گیا ۔ دونوں قلعہ شاہی کی عقبی جانب سے باہر نکلے ۔ یہاں فاران نے لشکرِ اسلام کے خیموں کو دیکھا جو اتنے زیادہ تھے کہ جہاں تک فاران کی نظر کام کرتی تھی ، خیمے ہی خیمے نظر آ رہے تھے ۔ امیر رکن الدین نے فاران کو بتایا کہ اسلامی لشکر کی تعداد ایک لاکھ ستر ہزار سے بھی زیادہ ہے اور اس میں تُرکی ، خلجی اور افغان سردار اور سپاہی ہیں ۔ جنگی

سازو سامان بھی بے پناہ تھا ۔ اسی شام فاران امیر رکن الدین کے ساتھ اجمیر کی طرف روانہ ہوگیا ۔ وہ دو تازہ دم عربی گھوڑوں پر سوار تھے ۔ ہر دس کوس کے بعد گھوڑے تبدیل کر دیئے جاتے ۔ راستے میں ایک سرائے میں انہوں نے تھوڑی دیر آرام کیا اور صبح ہوتے ہی پھر اجمیر کی طرف روانہ ہوگئے ۔

اسی طرح وہ منزلوں پر منزلیں طے کرتے اجمیر پہنچ گئے ۔ یہ شہر پرتھوی راج چوہان عُرف رائے پتھورا کی راج دہانی تھا ۔ شہر ایک قلعے کی طرح اونچی فصیل کے اندر آباد تھا ۔ شہر کے دروازے پر سپاہی پہرے پر موجود تھے ۔ انہوں نے مسلمان سواروں کو آتے دیکھا تو انہیں روک لیا ۔ امیر رکن الدین نے شاہی خط دکھا کر کہا کہ ہم تمہارے راجا کے نام شہنشاہ شہاب الدین غوری کا پیغام لے کر آئے ہیں ۔ سپاہی امیر اور فاران کے ساتھ ہو لئے اور انہیں راجا کے محل تک پہنچا دیا ۔ رائے پتھورا اپنے محل میں تخت پر بیٹھا تھا ۔ فاران نے دیکھا کہ راجا کا محل تنگ تنگ تھا ۔ جبکہ مسلمان بادشاہوں کے محل کُشادہ اور کھلے ہوتے تھے ۔ راجا کے محل کی چھت بھی نیچی تھی ۔ راجا نے صرف ایک ریشمی لہنگا باندھ رکھا تھا ۔ اس کا اوپر کا دھڑ ننگا تھا اور سینے اور بازوؤں پر ہیرے جواہرات چمک رہے تھے ۔ سر پر سونے کا تاج تھا جس میں قیمتی لعل و زمرّد جڑے تھے ۔

امیر اور فاران کو راجا کے سامنے پیش کیا گیا تو راجا نے پوچھا "تم اپنے بادشاہ کا کیا پیغام لائے ہو؟"

امیر رکن الدین حمزہ نے چمڑے کے تھیلے میں سے وہ خط نکال کر راجا کو دیا جس پر شاہی مُہر لگی ہوئی تھی ۔ راجا نے خط اپنے وزیر کو دیا ۔ وزیر نے خط پڑھ کر سنایا ۔ خط میں لکھا تھا:

"اے راجا! ہم مسلمان ہیں ۔ ایک خدا کی پوجا کرتے ہیں اور ایک رسولؐ کو مانتے ہیں ۔ میں تمہاری طرف امن کا پیغام بھیج رہا ہوں ، اور تمہیں اور تمہارے اہلِ خانہ اور اہل دربار کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہوں اسلام حق کا پیغام ہے ۔ امن کا پیغام ہے ۔ خدائے ذوالجلال کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام قبول کر لو اور ہمارے دوست بن جاؤ ۔ تاکہ تمہاری نجات ہو جائے اور تم اور تمہارے اہلِ خانہ دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جائیں ۔ تمہارا خیر خواہ ، شہاب الدین محمد غوری ۔

خط سن کر راجا اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس کا ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا ۔

اس نے کہا "اے امیر! اگر تم سفیر نہ ہوتے تو کالی ماتا کی سوگند میں تم دونوں کو زندہ نہ چھوڑتا ۔ ابھی یہاں سے واپس جاؤ اور اپنے بادشاہ کو میرا جواب سناؤ کہ میں تمہارے پیغام کو قبول نہیں کرتا"۔

امیر رکن الدین نے خط واپس لے لیا اور فاران کو ساتھ لے کر راجا کے تنگ تنگ اور نیم روشن محل سے باہر نکل آیا ۔ امیر نے باہر نکل کر گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا "راجا بدنصیب ہے ۔ اس نے اپنے محل میں آئی ہوئی ایمان کی روشنی کو واپس کر دیا ہے ۔ اس کی قسمت میں ذلت کی موت لکھی ہے"۔

فاران خاموش تھا ۔ اسے معلوم تھا کہ اجمیر وہ شہر ہے جہاں ایک دن چاروں طرف اسلام کا نور پھیل جائے گا ۔ اس کی فضا اللہ اکبر کی اذانوں سے گونجا کرے گی اور لوگ اسے اجمیر شریف کے نام سے پکارا کریں گے ۔ وہ دونوں اجمیر شہر کے دروازے سے نکل کر لاہور جانے والی شاہراہ پر ایک سرائے میں آگئے ۔ شام ہو رہی تھی ۔ امیر نے کہا :

"یہاں ہمیں تازہ دم گھوڑے نہیں ملیں گے ۔ بہتر ہے آدھی رات تک آرام کریں تاکہ گھوڑے دوبارہ سفر کے لئے تازہ دم ہو جائیں"۔

سرائے کا کھانا کھانے کی بجائے انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھایا ۔ گھوڑوں کو بھی چارہ کھلایا ، پانی پلایا اور آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے ۔ امیر کو نیند آگئی ۔ فاران جاگ رہا تھا ۔ رات ہو گئی تھی ۔ آسمان پر تارے نکل آئے تھے ۔ وہ اٹھ کر سرائے سے باہر آگیا ۔ قریب ہی ایک ندی بہتی تھی ۔ آس پاس دور دور تک ریت کے ٹیلے پھیلے ہوئے تھے ۔ اچانک اسے ایک انسانی سایہ دکھائی دیا جو ندی کے کنارے کنارے اس کی طرف چلا آرہا تھا ۔ سایہ قریب آیا تو فاران نے اسے پہچان لیا ۔ یہ وہی مرد بزرگ تھے جنہوں نے پہلی بار فاران کو کراماتی انگوٹھی عطا کی تھی ۔ فاران نے بڑے ادب سے انہیں السّلام علیکم کہا ۔ مرد بزرگ مسکرائے ، اپنی گُدڑی میں سے کراماتی انگوٹھی نکال کر فاران کو دی اور کہا :

"بد نصیب راجا نے مسلمان بادشاہ کا بھیجا ہوا اسلام کا پیغام قبول نہیں کیا ۔ تم خود اس کے پاس جاؤ اور اسے ایک بار پھر دائرہ اسلام میں آنے کی دعوت دو"۔

اس کے ساتھ ہی مرد درویش غائب ہو گئے ۔ فاران نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی ۔ انگوٹھی پہنتے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا ۔ اب وہ ہوا کی رفتار کے ساتھ چل سکتا تھا ۔ وہ فوراً وہاں سے نکل کر اجمیر شہر کی طرف چلا ۔ شہر کے دروازے بند کر دیے گئے تھے مگر فاران کسی کو نظر نہیں آتا تھا ۔ وہ آواز کی لہروں کی طرح بند دروازے میں سے گزر گیا ۔ وہاں سے وہ سیدھا راجا کے محل میں آگیا ۔ راجا دربار میں نہیں تھا ۔ فاران اسے محل میں تلاش کرنے لگا ۔ آخر اسے راجا اپنے خاص کمرے میں مل گیا ۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا ۔ فاران اس کے قریب رک گیا ۔ راجا اسے نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ فاران نے انگوٹھی اتار لی ۔

راجا نے اچانک اپنے سامنے ایک نوجوان کو دیکھا تو تلوار کھینچ لی "کون ہو تم؟" اس نے کہا اور فاران پر حملہ کرنے ہی لگا تھا کہ فاران نے جلدی سے انگوٹھی پہن لی اور اس کی نظروں سے غائب ہو گیا ۔ راجا بُت بنا کھڑا رہا ۔ فاران نے کہا "اے راجا! تم نے مجھے پہچانا نہیں ؟ میں صبح شہنشاہ شہاب الدین محمد غوری کے سفیر کے ساتھ تمہارے دربار میں آیا تھا ۔ میرا نام فاران ہے۔"

راجا نے کہا "کیا تم جادوگر ہو جو غائب ہو جانے کی طاقت رکھتے ہو؟"

فاران نے کہا "میں جادوگر نہیں ہوں لیکن ایک بزرگ کی دعا سے میرے اندر اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے کہ میں جب چاہوں غائب ہو سکتا ہوں"۔

راجا نے پوچھا "تم یہاں کس لئے آئے ہو؟"

فاران نے راجا کو ایک بار پھر اسلام کی دعوت دی جس پر اس نے کہا "تم اس سے بھی بڑے جادوگر بن کر میرے سامنے آؤ گے ، تب بھی میں تمہاری اس دعوت کو قبول نہیں کروں گا ۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اپنے بادشاہ سے جا کر کہو کہ اجمیر پر اسلام کا پرچم نہیں لہرائے گا"۔

اس پر فاران نے مسکرا کر کہا "تم تاریخ کے سفر سے واقف نہیں ہو، راجا ۔ تمہیں آنے والے دنوں کی بھی کچھ خبر نہیں ہے ۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ اس اجمیر شہر میں مسجدوں سے اللہ اکبر کی اذانوں کی صدائیں گونجا کریں گی ۔ آنے والے زمانے کو میں دیکھ رہا ہوں ، مگر تمہاری آنکھوں پر جہالت کی پٹی بندھی ہے ۔ اب بھی وقت ہے ، اسلام قبول کر لو ۔ تاریخ میں تمہارا نام زندہ رہ جائے گا"۔

راجا نے تلوار کھینچ کر اُس طرف حملہ کر دیا جہاں اس کے خیال میں فاران موجود تھا ۔ مگر فاران کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا ۔ اس نے جانے سے پہلے کہا "تم نے جنت کی بجائے دوزخ کو چُن لیا ہے راجا ۔ یہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی بد قسمتی ہے ۔ میں جا رہا ہوں ۔ میں تمہاری لاش کو شہر کے دروازے پر لٹکا ہوا دیکھ رہا ہوں"۔ اور وہ ہوا کی لہر کے ساتھ راجا کے کمرۂ خاص سے نکل گیا ۔

جس وقت وہ سرائے میں پہنچا، امیر سو رہا تھا ۔ آدھی رات کے بعد امیر کی آنکھ کھل گئی ۔ انہوں نے اسی وقت گھوڑوں پر زین کسی اور اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے ۔

لاہور پہنچ کر امیر رکن الدین نے شہنشاہ شہاب الدین محمد غوری کو راجا رائے پتھورا کا پیغام سنایا تو شہاب الدین تلوار کھینچ کر تخت سے نیچے اتر آیا ۔ اس نے اپنے سپہ سالاروں کو مخاطب کر کے کہا "اب کفر و اسلام کی جنگ ہو گی ، جس میں اللہ کے حکم سے فتح اسلام کی ہو گی"۔

اسی وقت طبلِ جنگ بجا دیا گیا ، لشکرِ اسلام میں اجمیر کی طرف کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور اسی روز مسلمانوں کا لشکر اجمیر کی طرف روانہ ہو گیا ۔

دوسری طرف راجا پرتھوی راج چوہان نے ہندوستان کے تمام راجاؤں کو اپنی مدد کے لئے خط لکھے ۔ سبھی راجاؤں نے پرتھوی راج کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اپنے لشکر لے کر اجمیر کی طرف چل پڑے ۔ تین دنوں کے اندر اندر ہندوستان کے سارے راجا اپنی فوج کے ساتھ پرتھوی راج چوہان کے گرد جمع ہو گئے ۔ راجا تین لاکھ راجپوتوں کی فوج لے کر شہاب الدین محمّد غوری کا مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھا ۔ یہ فوج دریائے سرستی کے کنارے ترائن کے مقام پر خیمہ زن ہو گئی اور مسلمانوں کے لشکر کا انتظار کرنے لگی ۔

ڈیڑھ سو راجاؤں نے کالی ماتا کا ٹیکا لگایا اور سوگند کھائی کہ جب تک مسلمانوں کو ختم نہ کریں گے ، تلواریں نیام میں نہیں ڈالیں گے ۔ دوسری طرف شہاب الدین محمّد غوری کا لشکر اسلام کا ہلالی پرچم لہراتا دشمن کے سامنے خیمہ زن ہو گیا ۔ منہ اندھیرے اٹھ کر شہاب الدین محمّد غوری نے نوافل ادا کئے اور اللہ کے حضور سر جھکا کر اسلام کی فتح کی دعا مانگی ۔ پھر اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر راجا کی فوج کا جائزہ لیا ۔ اس فوج کی تعداد اسلامی فوج کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھی ۔ مگر مسلمانوں کے حوصلے بلند تھے ۔ انہیں اپنے اللہ پر یقینِ کامل تھا کہ وہ سچ کو جھوٹ پر اور اسلام کو کُفر پر غالب کرے گا ۔

شہاب الدین غوری نے اپنی فوج کو چار حصّوں میں تقسیم کیا اور جنگ کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لی ۔ پرتھوی راج چوہان اور دوسرے راجا تین ہزار سے زیادہ ہاتھیوں کو لے کر شہاب الدین غوری کے مقابلے میں صف آرا ہوئے ۔ دونوں طرف سے مقابلہ شروع ہو گیا ۔ مسلمان اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگا کر ہندوؤں کی فوج پر ٹوٹ پڑے ۔ شہاب الدین محمّد غوری ایک تجربہ کار جرنیل کی طرح اپنی فوج کو کبھی دائیں ، کبھی بائیں اور کبھی قلب کی طرف سے لڑا رہا تھا ۔ مسلمان اس بے جگری سے لڑ رہے تھے کہ دشمن کے قدم اکھڑنے لگے ۔ ادھر مسلمانوں کے لشکر سے آنے والے آگ کے تیروں نے ہاتھیوں کے منہ پھیر دیئے اور انہوں نے اپنی ہی فوج کو کچلنا شروع کر دیا ۔

پرتھوی راج چوہان کے گرد اس کی فوج نے ایک حصار بنا رکھا تھا ۔ راجا خود ہاتھی پر بیٹھا جنگ کو دیکھ رہا تھا ۔ اپنی فوج کو بھاگتے دیکھ کر راجا کو تشویش ہوئی ۔ اتنے میں شہاب الدین غوری نے اپنا ہاتھی راجا کی طرف بڑھایا ۔ راجا کے محافظ نے نیزہ پھینکا اور راجا نے تیر چلایا ۔ تیر شہاب الدین محمّد غوری کے قریب سے ہو کر نکل گیا ۔ اس نے اپنے ہاتھی کو تیزی سے راجا کے ہاتھی کی طرف بڑھایا اور ہاتھی کے پاس پہنچ کر پوری طاقت سے نیزے کا وار کیا ۔ نیزہ ہاتھی کے مُنہ کے اندر چلا گیا اور اس کی ضرب سے ہاتھی کے دانت ٹوٹ گئے ۔ اب شہاب الدین محمّد غوری نے راجا پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ اس کا بازو کٹ کر نیچے گر پڑا ۔ اس کے ساتھ ہی راجا نیچے کو گرا ۔ اسے گرتا دیکھ کر مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر ایسا حملہ کیا کہ راجا کی فوج کے قدم اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگی ۔

مسلمانوں نے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کا پیچھا کیا اور انہیں کاٹتے چلے گئے ۔ جو بچ گئے وہ فرار ہو گئے ۔ شہاب الدین غوری کو فتح نصیب ہوئی اور اجمیر کے قلعے پر اسلام کا ہلالی پرچم لہرانے

لگا ۔ مسلمانوں نے رعایا کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا ۔ کسی کو قیدی نہ بنایا ۔ مسلمانوں کا یہ سلوک دیکھ کر سینکڑوں لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ۔

اس کے بعد سلطان شہاب الدین محمّد غوری نے دہلی کو بھی (جس کا اس زمانے میں اندر پرستھ نام تھا) فتح کر لیا اور اس کی حکومت اپنے غلام قطب الدین ایبک کے حوالے کر کے خود لاہور چلا گیا ۔ فاران بھی سلطان کی فوج کے ساتھ ہی لاہور آ گیا ۔ وہ سلطان کے امیر رکن الدین حمزہ ہی کی خدمت میں رہا ۔ کراماتی انگوٹھی اس کے پاس تھی مگر اس نے کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا اور اسے ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا تھا ۔ امیر رکن الدین کو بھی اس انگوٹھی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا ۔

لاہور پہنچنے کے بعد سلطان شہاب الدین محمّد غوری کو معلوم ہوا کہ غزنی اور پنجاب کے درمیان کوہستانی علاقے میں جو تراہیہ کے نام سے مشہور ہے ، کافروں کے بے شمار قبیلے آباد ہیں جو اس حد تک متعصّب ہیں کہ جو مسلمان اس علاقے سے گذرتا ہے ، اس کو شہید کر دیتے ہیں ۔ خاص طور پر پشاور کے اردگرد کے مسلمانوں کا انہوں نے جینا مشکل کر رکھا ہے ۔ سلطان شہاب الدین محمّد غوری قہر کی بجلی بن کر ان کافروں پر ٹوٹ پڑا ۔ کافروں نے سلطان کی فوج کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر تھوڑی دیر میں ہی مسلمان ان کے اوپر چڑھ آئے اور گھوڑوں سے انہیں روندنا اور تلواروں سے قتل کرنا شروع کر دیا ۔ کافروں کو شکست دے کر سلطان نے ان کو ایک بہت بڑے میدان میں جمع کر کے اسلام کا پیغام سنایا ۔ کافر لوگ اسلام کے پیغام اور سلطان کی رحمدلی اور انصاف پسندی کے سلوک سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ سارے کے سارے یعنی دو لاکھ کے قریب اسی وقت مسلمان ہو گئے ۔ اس کے بعد سلطان غزنی واپس چلا گیا ۔ مگر ایک سال بعد پھر ہندوستان واپس آیا کیوں کہ پنجاب کی ایک جنگ جو قوم کھوکھر نے بغاوت کر دی تھی ۔ سلطان کھوکھروں کی بغاوت کچل کر واپس جا رہا تھا کہ دریائے جہلم کے کنارے ایک کھوکھر نوجوان نے سلطان کے خیمے میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیا ۔ سلطان کو غزنی کے اس مقبرے میں دفن کیا گیا جو سلطان نے اپنی بیٹی کے لئے بنوایا تھا ۔

سلطان کی وفات کے بعد فاران کا جی اُچاٹ ہو گیا ۔ وہ لاہور ہی میں امیر رکن الدین حمزہ کی حویلی میں تھا ۔ ایک روز وہ دریا پار جنگل میں امیر کے ساتھ شکار پر گیا ہوا تھا کہ بڑے زور کی آندھی چلی ۔ درخت اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگے ۔ فاران اپنے امیر سے بچھڑ گیا ۔ پھر بارش شروع ہو گئی ۔ فاران کو ایک ٹوٹا پھوٹا مقبرہ نظر آیا ۔ اس نے وہاں پناہ لی ۔ بارش کا طوفان شدّت اختیار کر گیا ۔ پانی مقبرے میں آنے لگا ۔ فاران نے سوچا کہ کیوں نہ وہ کراماتی انگوٹھی پہن کر وہاں سے غائب ہو جائے ۔

وہ جیب سے انگوٹھی نکالنے لگا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ انگوٹھی غائب تھی ۔ اتنے میں مقبرے میں سے کسی سبز پوش بزرگ کی آواز آئی "فاران ! تم تاریخ کے طویل سفر پر ہو ۔ تمہیں مسلمانوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے پاکستان کی تحریک اور قائدِ اعظم تک پہنچنا ہے ۔ اس وجہ سے تمہارے ساتھ حادثات ہوتے رہیں گے ۔ ان کی تمہیں زیادہ فکر نہیں کرنی ہوگی ۔ تمہاری انگوٹھی اس وقت ہندوستان کے بادشاہ غیاث الدین بلبن کے ایک غلام فخرو کے پاس ہے ۔ تم یہاں سے سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں جانے والے ہو"۔

فاران نے عرض کی "حضور ، کیا میں رضیہ سلطانہ اور قطب الدین ایبک کا زمانہ نہیں دیکھ سکوں گا"؟ اس پر سبز پوش بزرگ نے فرمایا "قطب الدین ایبک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دہلی میں جامع مسجد بنائی اور ایک لاٹ تعمیر کروائی ۔ وہ خیرات بہت کرتا تھا ۔ رضیہ سلطانہ ایک نیک دل حکمران عورت تھی مگر اس نے صرف تین سال حکومت کی ۔ وہ باغیوں سے ہی لڑتی رہی اور آخر معزالدین بہرام شاہ نے اسے قتل کروا دیا ۔ غیاث الدین بلبن کے زمانے میں تمہیں اس لئے لے جایا جا رہا ہے کہ وہ ایک فیاض ، بہادُر ، علم دوست اور منصِف مزاج بادشاہ تھا ۔ ایک بات اور یاد رکھو ! تمہیں تاریخ کے تمام واقعات کا علم ہے ۔ کیونکہ تم ان واقعات کو تاریخ کی کتابوں میں پڑھ چکے ہو ۔ تمہیں ان واقعات کو پوری طرح ظاہر نہیں کرنا ہو گا ۔ ہاں تم ان کے اشارے دے سکتے ہو ۔ اب جاؤ ۔ اس وقت سلطان غیاث الدین بلبن دہلی سے بیس میل دور شکار کھیلتا ہوا ایک جنگل میں پہنچا ہے ۔ آگے کیا ہو گا ؟ یہ تم خود جا کر دیکھ لو گے"۔

سبز پوش بزرگ کی آواز خاموش ہو گئی ۔ بجلی چمکی ، بادل گرجے اور فاران کی آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں (باقی آئندہ) ۔

جب مُوسلا دھار بارش ہو تو انگریز کہتے ہیں: It is raining cats and dogs. ۔ خیر ، دُنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ تو نہیں ملتا کہ کہیں کُتّے اور بلّیاں برسے ہوں ، البتہ ایسی اِطّلاعات آتی رہتی ہیں کہ فُلاں مقام پر مچھلیوں یا مینڈکوں کی بارش ہُوئی یا سِکّے برسے یا کالے پانی اور خُون کی بارش ہُوئی ۔

اِس قسم کی بارشوں کے بارے میں سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ بعض وقت ہوا کے تیز جھکّڑ یا بگولے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو زمین پر سے اُٹھا کر اُوپر لے جاتے ہیں ، جو بارش کے ساتھ واپس زمین پر گر پڑتے ہیں ۔ اب تک دُنیا میں اِس قِسم کی جو حیرت انگیز بارشیں ہُوئی ہیں ، اُن میں سے چند کا حال سُنیے ۔

مچھلیوں کی بارِش

28 مئی 1887 کو انگلینڈ کی ایک کاؤنٹی وورسیسٹر شائر کے ایک مقام باؤٹن رِفیلڈ زمیں مچھلیوں کی بارش ہُوئی ۔ لوگ ٹوکریاں اور تھیلے لے کر گھروں سے نکل آئے اور سیروں کے حِساب سے مچھلیاں جمع کر لیں ۔ کہتے ہیں ، باؤٹن رِفیلڈز کے لوگوں نے ہفتہ بھر یہی مچھلیاں کھائیں اور کافی پیسے بچا لیے ۔

ایسا ہی ایک واقعہ 24 اگست 1918 کو شمالی انگلینڈ کی بندرگاہ سنڈر لینڈ میں پیش آیا ۔ صُبح کے وقت لوگ باگ اپنے اپنے کام کاج پر جا رہے تھے کہ ایکا ایکی کالی گھٹا جُھوم کے آئی اور گھن گرج کے ساتھ مُوسلا دھار بارش ہونے لگی ۔

لوگ پناہ لینے کے لیے دُکانوں اور دفتروں کے سائبانوں تلے کھڑے ہو گئے ۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بارش کے ساتھ ہزاروں چھوٹی چھوٹی بام مچھلیاں (Eels) بھی آسمان سے گر رہی ہیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنڈر لینڈ کی تمام سڑکیں مچھلیوں سے بھر گئیں ۔ جب بارش رُکی تو میونسپلٹی کے مُلازموں کو سڑکیں صاف کرنے میں کئی گھنٹے لگے ۔

بطخوں کی بارش

1969 میں ریاست ہائے مُتّحدہ امریکا کی ایک ریاست میری لینڈ میں بطخوں کی بارش ہُوئی اور لوگوں نے بطخوں سے اپنے فِرج بھر لیے ۔ لیکن اُن لوگوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا جو نائیوں کی دُکانوں سے سر مُنڈوا کر نکلے تھے ۔

برف کے گولوں کی بارش

ژالہ باری (اولے پڑنا) برطانیہ میں ایک عام بات ہے ۔ کوئی شخص ان کی طرف توجُّہ نہیں کرتا ۔ لیکن 11 اکتوبر 1980 کو انگلینڈ کی ایک کاؤنٹی "اسیکس" کے ایک مقام رام فورڈ کے گاف کے میدان میں جو اولے پڑے وہ اولے نہیں گولے تھے ۔ ان میں سے بعض فُٹ بال سے بھی بڑے تھے ۔

مینڈکوں کی بارش

مئی 1981 کی ایک صُبح کو ، جُنوبی یُونان کے ایک گاؤں نارپ لائن پر اچانک آسمان سے مینڈک برسنے لگے ، اور مینڈک بھی ایسے جو صرف افریقہ میں پائے جاتے ہیں ۔ سائنس دانوں نے بتایا کہ اِن مینڈکوں کو ہوا کے کسی زبردست بگولے نے افریقہ کی کسی دلدل سے اُٹھایا ہو گا ، جو انہیں اُڑا کر یُونان لے آیا ۔

یُونان میں اِس قسم کی بارش کا یہ پہلا واقعہ نہیں تھا ۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہاں تین دن تک مچھلیوں کی بارش ہوتی رہی تھی ۔
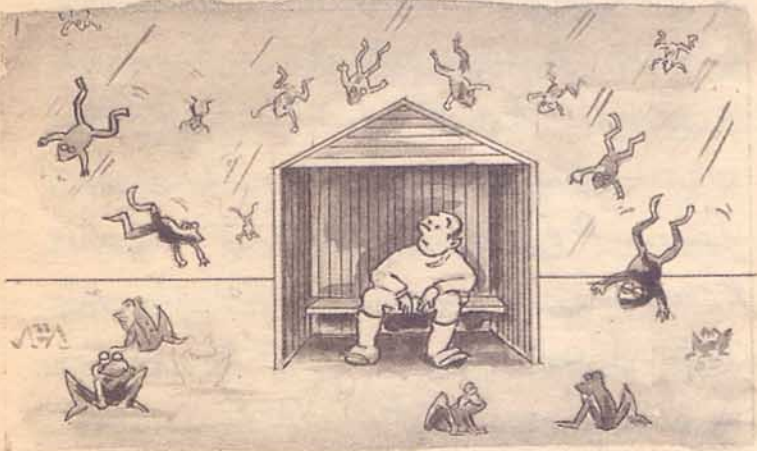
مُردوں کی بارِش

یہ واقعہ ناقابلِ یقین سا ہے لیکن ہے سچّا ۔ 1930 میں ، ایک طُوفانی بارش کے دوران ، الجزائر کی اہگر پہاڑی پر پانچ آدمیوں کی لاشیں ، برف میں جمی ہُوئی ، آسمان سے گریں ۔ تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ گلائڈر میں سفر کر رہے تھے کہ اُس میں خرابی پیدا ہو گئی ۔ اُنہوں نے پیراشُوٹوں کے ذریعے نیچے چھلانگ لگائی ۔ نیچے ٹھنڈا یخ بادل تھا ، جس میں وہ جم گئے اور پھر بارش کے ساتھ پہاڑی پر گر پڑے ۔ (س ۔ ل)

# جلدی قدم اُٹھاؤ

آندھی سے پہلے پہلے — پہنچیں گھروں میں اپنے
کیا تیز اب ہوا ہے — اِک شور بڑھ رہا ہے
دُھول اُڑ کے آ رہی ہے — چہروں پہ چھا رہی ہے
لو ، ہاکیاں سنبھالو — وہ گیند بھی اُٹھا لو
جلدی قدم اُٹھاؤ — اور پیچھے پیچھے آؤ

آندھی سے پہلے پہلے
پہنچیں گھروں میں اپنے

وہ آئی بارش ، آئی — کپڑے بھگونے والی
چھائی گھٹا، وہ کالی — بڑھنے لگی ہے سردی
کپڑے خراب ہوں گے — دھونے پڑیں گے پھر سے
ناراض ہوں گی امّی — چھوڑو بھی اب یہ سُستی
لو ، میرا ہاتھ تھامو — جلدی قدم اُٹھاؤ

بارش سے پہلے پہلے
پہنچیں گھروں میں اپنے

حفیظ الرحمن احسن

# دھنک کیسے پڑتی ہے

بارش برس کے تھمے اور سورج اپنا چمکتا دمکتا مکھڑا بادلوں کی اوٹ سے نکالے تو، بعض وقت، سُورج کے بالکل سامنے آسمان پر رنگین کمان سی بن جاتی ہے۔ اِسے اُردو میں دھنک، سنسکرت میں اِندر دھنُش (اِندر دیوتا کی کمان)، عربی میں قوسِ قُزح (شیطان کی کمان)، فارسی میں کمر دُون یا کمانِ رُستم اور انگریزی میں Rainbow یعنی بارش کی کمان کہتے ہیں۔

سُورج کی روشنی سفید دِکھائی دیتی ہے، لیکن دراصل اِس میں سات مُختلف رنگ ہوتے ہیں جو آپس میں گڈ مڈ ہونے کی وجہ سے الگ الگ دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن جب یہ روشنی کسی شیشے یا پانی میں سے گذرتی ہے تو اس کے ساتوں رنگ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ایک منشور (Prism) لیجئے۔ شیشے کا یہ مُثلث ٹکڑا بازار میں عام مِلتا ہے۔ اُسے سُورج کی طرف کیجئے اور پھر اُس میں جھانک کر دیکھیے اور آہستہ آہستہ گھماتے جائیے۔ اس کے اندر طرح طرح کے رنگ نظر آئیں گے۔

اب کسی اندھیرے کمرے میں جائیے اور اِتنی سی کھڑکی کھولیے کہ اُس میں سے سُورج کی باریک سی کِرن اندر آسکے۔ (سورج کھڑکی کے سامنے ہونا چاہئے)۔ اس کرن کے سامنے میز رکھیے اور میز پر سفید کاغذ۔ اب منشور کو روشنی کے سامنے کر کے آہستہ آہستہ گھمائیے۔ کاغذ پر رنگین دھنک سی بن جائےگی۔

بالکل اسی طرح آسمان پر دھنک پڑتی ہے۔ بارش تھمنے کے بعد ہوا میں پانی کے ننھے ننھے قطرے رہ جاتے ہیں جو روشنی کے منشور کا کام دیتے ہیں۔ جب سورج کی کرنیں اِن قطروں میں سے گذرتی ہیں تو ہم آسمان پر، کمان کی شکل میں، اُن کے علیٰحدہ علیٰحدہ رنگ دیکھتے ہیں۔ مگر یہ تماشا تھوڑی دیر کے لئے ہی ہوتا ہے۔ جُوں ہی قطرے ختم ہوتے ہیں، رنگ آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور رنگین کمان کی جگہ سفیدی پھیل جاتی ہے۔

دھنک پڑنے کے لیے ضروری ہے کہ سورج یا تو عین مشرق میں ہو یا عین مغرب میں۔ اگر سُورج مشرق کی طرف ہو گا تو دھنک مغرب کی طرف پڑےگی۔ مغرب کی جانب ہو گا تو مشرق کی طرف۔

آپ خُود بھی دھنک بنا سکتے ہیں۔ سہ پہر کے وقت پچکاری میں پانی بھر کے سُورج کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جائیے اور اُوپر ہوا میں جلدی جلدی پانی چھڑکیے۔ آپ کے سامنے ننھی سی دھنک پڑ جائےگی۔ اب ذرا جلدی جلدی اِس کے رنگ گِنیے: سُرخ، نارنجی، زرد، سبز، نیلا، گہرا نیلا (اِنڈیگو) اور بنفشی۔ سُورج کی روشنی میں یہی سات رنگ ہوتے ہیں۔

دھنک میں چھ رنگ تو صاف نظر آجاتے ہیں، مگر ساتواں رنگ یعنی گہرا نیلا صرف وُہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کی نگاہ بہُت تیز ہو۔

# موتی کیسے بنتے ہیں

آپ نے سیپی دیکھی ہوگی۔ یہ ایک سمُندری جان دار کا خول ہوتا ہے، جسے صدفہ (Oyester) کہتے ہیں۔ جب صدفہ بچّہ ہوتا ہے تو اُس کا خول نہیں ہوتا اور وہ جیلی کے ایک ننّھے سے ٹکڑے کی طرح سمُندر کی سطح پر بہتا پھرتا ہے۔ کُچھ دنوں بعد اُس کے جسم کے چاروں طرف خول بننا شروع ہوتا ہے۔ جُوں جُوں خول بڑھتا اور سخت ہوتا ہے، صدفہ بھاری ہوتا جاتا ہے، اور جب زیادہ بھاری ہو جاتا ہے تو سمندر کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہاں اُسے ایک جگہ ٹِکنے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سہارا عام طور پر کوئی چھوٹی سی چٹان یا سمندری جھاڑی وغیرہ ہوتا ہے۔

جب صدفے کو بُھوک لگتی ہے تو وہ اپنا خول (سِیپی) کھولتا ہے، جس سے تھوڑا سا پانی اُس کے اندر چلا جاتا ہے۔ اِس پانی میں ننّھے ننّھے کیڑے مکوڑے بھی ہوتے ہیں، جنہیں وہ کھا جاتا ہے۔

کبھی کبھار ریت کا کوئی ذرّہ یا ایسی ہی کوئی سخت چیز پانی کے ساتھ صدفے کے پیٹ میں چلی جاتی ہے۔ یہ ذرّہ صدفے کے پیٹ کی جِھلّی میں چُبھتا ہے تو اُسے تکلیف ہوتی ہے۔ اِس چُبھن کو دُور کرنے کے لئے صدفہ کیلسیم کاربونیٹ جیسا لُعاب دار مادّہ خارج کرتا ہے، جو اُس ذرّے کے چاروں طرف لپٹ جاتا ہے، اور کُچھ عرصے بعد سخت ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد صدفہ مزید مادّہ خارج کرتا ہے اور وہ بھی ذرّے کے گرد لپٹ کر سخت ہو جاتا ہے۔ اِس عمل کو وہ بار بار دوہراتا ہے اور ہر بار لُعاب دار مادّے کی ایک تہ ذرّے پر چڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ ایک بڑا، سخت لیکن بہُت خُوب صُورت موتی بن جاتا ہے۔ اِس ذرّے کو موتی بننے میں چار سال لگتے ہیں۔

سب سے اچھے اور قیمتی موتی خلیجِ فارس (پرشین گلف) میں پائے جاتے ہیں۔ اِن کے بعد سری لنکا، خلیجِ پناما، کیلی فورنیا، مغربی آسٹریلیا اور غربُ الہند (ویسٹ انڈیز) کے موتیوں کا نمبر ہے۔

سمُندر کی تہ سے موتی نکالنے والے غوطہ خور صدفوں کو اُسی وقت سمُندر سے نکال لیتے ہیں جب وہ بھاری ہو کر تہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اُن کے خول کھول کر اُن میں ریت کے ذرّے ڈال دیتے ہیں اور پھر اُنہیں تالاب میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اِس طرح اُنہیں بہُت سے موتی مِل جاتے ہیں۔ اِنہیں قُدرتی موتی کہتے ہیں اور یہ بہُت مہنگے داموں بِکتے ہیں۔ مصنُوعی موتی مصنُوعی طریقوں سے بنائے جاتے ہیں۔ یہ بہُت سستے ہوتے ہیں (س-ل)

محمد اقبال ثاقب

# پھول سی تتلی

بیلو اور مونا آج پھر باغ کی طرف جا رہے تھے ۔ یہ باغ اُن کے گھر سے تقریباً 2 فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ وہ بہت خُوش تھے اور تیز تیز قدم اُٹھا کر باغ کی طرف چل رہے تھے ۔ مونا کے ہاتھ میں شیشے کا ایک چوکور ڈبا تھا اور بیلو کے پاس دھاگوں کی ایک جالی تھی ۔ وہ چلتے چلتے طرح طرح کے منصوبے بنا رہے تھے کہ آج بہت ساری تتلیاں پکڑ کر لائیں گے ۔

مونا اور بیلو باغ میں پہنچے اور گلاب کے پودوں کی کیاریوں کی طرف چلے گئے ۔ گلابوں کے پودے پھولوں سے لدے ہوئے تھے ۔ اور رنگ برنگے پُھول نہایت دِل کش منظر پیش کر رہے تھے۔ پھولوں پر بے شُمار تتلیاں پھر رہی تھیں ۔ یُوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اللہ میاں نے پھُولوں میں جان ڈال دی ہو اور وہ اُڑنے لگے ہوں ۔ مونا کی نظر ایک پیلے اور سیاہ رنگ کی دھاریوں والی خُوب صورت تتلی پر پڑی ۔ وہ بیلو سے کہنے لگی:

"بھائی ! وہ دیکھو — کِتنی خُوب صورت تِتلی ہے ۔ سب سے پہلے اِسے جالی ڈال کر پکڑو"۔

بیلو نے اُس تِتلی کی طرف دیکھا جو بڑے مزے سے سفید رنگ کے پُھول پر بیٹھی تھی ۔ وہ جالی لے کر آہستہ آہستہ اُس پُھول کی طرف بڑھنے لگا ۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ جالی ڈال کر اُس تتلی کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا ۔ تِتلی کو پکڑ کر بیلو نے شیشے کے ڈبّے میں ڈال دِیا ۔ مونا اُسے ڈبّے میں اِدھر اُدھر اُڑتے دیکھ کر بُہت خُوش ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ یہ میری تِتلی ہے ۔ اِس کو میں لوں گی ۔

بیلو اُس تتلی کو پکڑنے کے بعد دوسری تتلیوں کا پیچھا کرنے لگا ۔ وہ تتلیوں کو پکڑ پکڑ کر ڈبّے میں ڈالتا رہا ۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے تقریباً 10 تتلیاں پکڑ کر ڈبے میں ڈال دیں ۔ اُس نے ایک اور تتلی پکڑی اور مونا کی طرف دوڑا ۔

"مونا! مونا! دیکھو یہ ویسی ہی خوب صورت تتلی ہے جیسی ہم نے پہلے پکڑی ہے ۔ یُوں لگتا ہے جیسے یہ اُس کی چھوٹی بہن ہے"

"ہاں بھیّا! یہ بھی سیاہ اور پیلی دھاریوں والی تتلی ہے ۔ یہ سو فی صد اُس کی بہن ہے" مونا نے جواب دیا ۔

بیلو نے شیشے کے ڈِبّے کا احتیاط کے ساتھ تھوڑا سا ڈھکنا کھولا اور اُس تتلی کو بھی ڈبّے میں ڈال دیا ۔

"اب ہمیں واپس چلنا چاہیئے"۔ بیلو نے یہ کہتے ہو جالی مونا کے ہاتھ میں تھما دی اور خود ڈبّے کو پکڑ کر گھر کی طرف چلنے لگا ۔ وہ دونوں رنگ برنگی تتلیوں کو ڈبّے میں اِدھر اُدھر اُڑتے دیکھ کر بہت خُوش ہو رہے تھے ۔ مونا کہنے لگی:

"بیلو بھیّا! اُن دو تتلیوں میں سے ننھی تتلی میں لوں گی ۔ مُجھے وہ بُہت اچھّی لگتی ہے ۔"

"نہیں مونا! — بڑی تتلی تمہاری ہے ۔ کیونکہ تم پہلے ہی کہ چکی ہو کہ یہ میں لوں گی" ۔ بیلو نے جواب دیا ۔ بیلو اور مونا یہی تکرار کرتے کرتے گھر پہنچ گئے۔ وہ ابھی گھر پہنچے ہی تھے کہ اُن کے پیچھے پیچھے جمّی، گڈو، عاشی اور ببو بھی آدھمکے ۔ یہ بچّے بھی اُسی گلی میں رہتے تھے ۔ انہوں نے بیلو اور مونا کو تتلیاں لاتے ہوئے دیکھ لیا تھا ۔ ہر کوئی یہی کہ رہا تھا، بیلو بھیا، مجھے بھی تتلی دینا ۔

سبھی تتلیاں شیشے کے ڈبّے میں اِدھر اُدھر اُڑ رہی تھیں ۔ مگر وہ دونوں تتلیاں دبک کر ایک کونے میں بیٹھی تھیں ۔ بیلو نے ڈبّے کا تھوڑا سا ڈھکنا کھولا اور احتیاط کے ساتھ ایک ایک تتلی نکال کر بچّوں کو دیتا رہا ۔ آخر میں وہی دو تتلیاں بچ گئیں ۔

بچّے تتلیوں سے کھیل رہے تھے ۔ وہ تتلی کو ایک پر سے پکڑ کر اُس کو دوسرے پر سے پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھ کر بُہت خُوش ہو رہے تھے ۔ اِسی طرح کھیلتے ہوئے دو تتلیوں کے پَر ٹوٹ چکے تھے ۔ پروں سے رنگ اُتر کر بچّوں کے ہاتھوں کو لگ گیا تھا ۔ تھوڑی ہی دیر بعد کئی تتلیوں نے بچّوں کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا ۔

وہ دونوں تتلیاں شیشے کے ڈبّے میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں ۔ اُن کا خوف کے مارے بُرا حال تھا ۔ مونا نے بیلو سے آنکھ بچا کر ڈبا کھولا اور ننّھی تتلی کو نکال لیا ۔ بیلو کی جونہی نظر ننّھی تتلی پر پڑی وہ مونا کی طرف دوڑا ۔ اُس نے جَھٹ اپنا ہاتھ ننّھی تتلی پر ڈال دیا ۔ تتلی بے چاری مونا کے ہاتھ میں تڑپ رہی تھی ۔ اُسے اپنا انجام نظر آ رہا تھا ۔ اب تتلی کا ایک پَر مونا کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا بیلو کے ہاتھ میں ۔ مونا چلّانے لگی "بیلو بھیّا!

چھوڑ دو ۔ بیچاری مرجائے گی"۔ بیلو کہہ رہا تھا "مونا! تم چھوڑ دو ۔ یہ میری تتلی ہے" ۔ تتلی بیچاری اُن دونوں کے ہاتھوں میں ایسے تڑپ رہی تھی جیسے پانی کے بغیر مچھلی ۔ بڑی تتلی ڈبّے میں سے ننّھی تتلی کی حالت دیکھ رہی تھی اُسے ننّھی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں ۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔

مونا اور بیلو کی چھینا جھپٹی سے ننّھی تتلی کا ایک پَر ٹوٹ گیا تھا۔ شور سُن کر دادی امّاں وہاں پہنچ گئیں۔

"ارے! یہ کیا؟ ہر طرف تتلیاں ہی تتلیاں مری پڑی ہیں۔ بیلو مونا کا ہاتھ چھوڑ دو"۔ دادی امّاں بولیں۔

بیلو نے مونا کا ہاتھ چھوڑا تو ننّھی تتلی بے جان ہو کر مونا کے ہاتھ سے گِر پڑی۔ مونا نے جب مری ہوئی خُوب صورت تتلی کو دیکھا تو اُسے بہت دُکھ ہوا۔ دادی امّاں کہنے لگیں:

"اِن ننّھی مُنّھی بے قصور جانوں کو ضائع کر کے تمہیں کیا ملتا ہے؟"

اچانک دادی امّاں کی نظر شیشے کے ڈِبّے پر پڑی۔ "ارے یہ کیا؟ کتنی خُوب صورت تتلی تُم نے ڈِبّے میں بند کر رکھی ہے۔ کیسے بیچاری دبک کر بیٹھی ہے!" دادی امّاں یہ کہتے ہوئے ڈبّے کی طرف بڑھیں اور ڈبّے کا ڈھکنا کھول دیا۔ جونہی ڈھکنا کھلا، تتلی ڈبے سے نِکل کر فضا میں اُڑنے لگی۔ دادی امّاں کے ساتھ مونا اور بیلو بھی تتلی کو باغ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

تتلی باغ میں پہنچی تو اُس کے امّی اور ابّو بے حد پریشان تھے۔ انہوں نے ننّھی تتلی کے بارے میں پوچھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے سارا واقعہ اپنے امّی ابّو کو سُنا دیا۔ وہ یہ سب کچھ سُن کر بُہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر یہ بچّے ایسے ہی تتلیوں کو پکڑ کر مارتے رہے تو ہماری نسل ختم ہو جائے گی۔ ہمیں ضرور کچھ کرنا چاہیے۔ دونوں میاں بیوی کافی دیر تک سوچتے رہے۔ مگر اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ اچانک تتلی کے ابّو کو خیال آیا کہ ہمیں اِس سلسلے میں پُھولوں کی مدد لینی چاہیے۔ ہمارا اُن کے ساتھ بڑا پُرانا تعلّق ہے۔ ہم اُن سے اِتنا پیار کرتے ہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے۔

یہ سوچ کر دونوں میاں بیوی اُٹھے اور پھولوں کے پاس آ گئے۔ شام ہونے والی تھی۔ میاں نے پھولوں کو مخاطب کرتے ہو کہا:

"اے پیارے پُھولو! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارا اور آپ کا کِتنا پُرانا ساتھ ہے۔ آپ کو یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم آپ سے

کتنا پیار کرتے ہیں۔ اب ہماری زندگیاں خطرے میں ہیں۔ بے شمار تتلیاں پہلے ہی موت کی نیند سُلائی جا چکی ہیں۔ کبھی ہماری بھی باری آجائے گی اور اِس طرح آہستہ آہستہ ہماری نسل ختم ہو جائے گی۔ پھر آپ کو پیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ خدا کے لیے ہماری کچھ مدد کریں"۔

تتلی کے اِن الفاظ کا پھولوں پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم نے اِن کی مدد نہ کی تو اِن کی اور کون مدد کرے گا؟ پھولوں میں سے ایک پھول بولا "پیاری تتلیو! اب آپ جائیں، ہم ان شاءاللہ ضرور آپ کی مدد کریں گے"۔

یہ سُن کر دونوں میاں بیوی واپس آگئے۔ پھول سر جوڑ کر تتلیوں کی مدد کے بارے میں سوچنے لگے کہ اُن کی کیسے مدد کی جائے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ تمام پھول ساری رات اِسی فِکر میں جاگتے رہے۔ مگر اُن میں سے کسی کے ذہن میں کوئی ترکیب نہ آئی۔ وہ سب کے سب سخت پریشان تھے۔ یہی غور و فِکر کرتے کرتے صُبح ہو گئی۔

صُبح کو باغ میں جب ہوا داخل ہوئی تو وہ پھولوں کے پاس گئی۔ ہوا کے آنے پر کوئی پھول نہ تو مُسکرایا اور نہ کسی نے ہوا کا استقبال کیا۔ ہوا نے تمام پُھولوں کو بُہت گُدگُدایا مگر سب بے سُود۔ پُھولوں پر ذرّہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور وہ اُسی طرح پریشان کے پریشان مُرجھائے ہوئے کھڑے رہے۔ اُنہیں یہ فِکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر آج پھر بچّوں نے تتلیوں پر حملہ کر دیا تو ہم اُن کی کیسے مدد کریں گے؟

ہوا مایوس ہو کر واپس چلی گئی۔ اب تو دِن کافی نِکل آیا تھا۔ اتنے میں ایک شہد کی مکھی پھولوں کی طرف آگئی۔ مکھی نے جب پھولوں کے لٹکے ہوئے چہرے دیکھے تو ایک پُھول سے پوچھا:

"پُھول بھائی! کیا بات ہے۔ آج آپ سب کیوں پریشان ہیں؟"

پُھول نے جواب دیا: "مکھی بہن! مسئلہ یہ ہے کہ اِس باغ میں کچھ بچّے آتے ہیں اور تتلیوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور مار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں تتلیوں نے ہم سے مدد مانگی ہے۔ ہم سب پریشان ہیں کہ اُن کی کیسے مدد کی جائے؟"

مکھی پُھول کی یہ بات سُن کر مسکرائی اور کہا "بس یہی مسئلہ تھا؟ آپ سب اِسی لیے پریشان ہیں؟ پھول بھائی! آپ اب پریشان نہ ہوں اور مسکرائیں۔ اِس سلسلے میں ہم آپ کی مدد کریں گے۔"

پُھول نے پوچھا "وہ کیسے؟"

مکھی نے جواب دیا کہ میں جا کر اپنی ملکہ سے کہوں گی کہ ہمارے پُھول تتلیوں کو بچّوں کے ہاتھوں سے بچانا چاہتے ہیں۔ مجھے امید ہے ملکہ ضرور آپ کا یہ مسئلہ حل کر دے گی۔

مکھی کا یہ جواب سُن کر پُھول مطمئن ہو گیا۔ مکھی اپنے چھتّے کی طرف روانہ ہو گئی اور اُس نے جا کر ملکہ سے تمام احوال بیان کر دیا۔ ملکہ نے فوراً 20 سپاہیوں کی ایک ٹیم بنائی اور اُن کو حُکم دیا کہ وہ روزانہ باغ میں گھوم پھر کر پہرا دیا کریں اور اگر کوئی بچّہ تتلیوں کو پکڑتا ہوا دیکھیں تو فوراً اُس پر حملہ کر دیں۔

ملکہ نے پُھولوں کی طرف بھی پیغام بھجوا دیا کہ اب اُنہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے تتلیوں کی حفاظت کے تمام انتظامات کر لیے ہیں۔ پھول یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور ملکہ کا شکریہ ادا کیا۔

پھولوں نے تتلیوں کو بھی بتا دیا کہ اب اُنہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُن کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست ہو گیا ہے۔ یہ سُن کر تتلیاں بھی بُہت خُوش ہوئیں اور پُھولوں اور ملکہ کا شکریہ ادا کیا۔

اگلے روز جب ببلو اور مونا دوبارہ تتلوں کو پکڑنے کے لیے باغ میں پہنچے تو سپاہی تیار تھے۔ وہ ببلو اور مونا کے پیچھے لگ گئے۔ وہ خوف سے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ گھر میں پہنچ کر انہوں نے دادی اماں کو سارا ماجرا سُنایا۔ دادی اماں نے اُن سے کہا کہ آئندہ کبھی تتلیاں پکڑنے باغ میں مت جانا۔ اب تتلیوں نے اپنی حفاظت کا بندوبست کر لیا ہے"۔

قرآنی کہانی

# شاہی محل سے فرار

ڈاکٹر عبدالرؤف

محل کی اِنتظامیہ نے ننھے موسیٰؑ کی دیکھ بھال اور دودھ پلانے کے لئے مناسب دایہ کی تلاش شروع کر دی۔ جب موسیٰؑ کی والدہ کو پتا چلا تو وہ بھی بھاگم بھاگ شاہی محل جا پہنچیں اور اپنا اتا پتا بتائے بغیر شہزادے کی دیکھ بھال کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ خوش قسمتی سے اُنہیں دایہ منتخب کر لیا گیا۔ ننھے موسیٰؑ کے والدِ محترم پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ آپ کے ایک بھائی ہارون آپ سے تین سال بڑے تھے۔ جب ماں کو دایہ کی ملازمت مل گئی تو اُنہوں نے ہارون کو بھی اپنے ساتھ محل میں رکھ لیا اور یوں فرعون کے شاہی محل میں سارے خاندان کا ملاپ ہو گیا۔ آپ کی والدہ بہت احتیاط کرتی تھیں کہ کسی کو اصل باتوں کا علم نہ ہونے پائے۔

شاہی محل کے آرام دہ ماحول میں رہائش سے موسیٰؑ ایک صحّت مند نوجوان کی صورت پروان چڑھنے لگے۔ ایک رات جب سنّاٹے کا عالم طاری تھا، وہ چُپکے سے محل سے باہر نکل آئے اور مصر کے روزمرّہ حالات سے آگاہی کے لئے گلی بازار میں ٹہلنے لگے۔ اتنے میں آپ کی نگاہ ایک غریب اسرائیلی پر پڑی جسے ایک بھاری بھرکم مصری بے دردی سے مار رہا تھا۔ موسیٰؑ بیچ بچاؤ کے لئے آگے لپکے تو آپ کے ایک اِتّفاقی مُکّے سے ظالم مصری ہلاک ہو گیا۔

موسیٰؑ بازار سے فوراً محل پلٹ آئے۔ مصری کی موت کا اُنہیں افسوس بھی ہوا اور پریشانی بھی۔ وہ رات بھر اس اِتّفاقی حادثے پر مُضطرب رہے۔ صبح ہوئی تو وُہ اس واقعے کے بارے میں لوگوں کے تأثرات کا جائزہ لینے کے لئے بازاروں میں گھومنے لگے۔ ابھی کچھ دُور ہی گئے ہوں گے کہ آپ کو دو آدمی گُتھم گُتھا ہوتے دکھائی دیے۔ موسیٰؑ اُن کے قریب آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گزشتہ رات والا وُہی مظلوم اسرائیلی اس دفعہ ایک اور شخص کی بے تحاشا پٹائی کر رہا تھا۔ موسیٰؑ دونوں کو چُھڑانے لگے تو اسرائیلی چلّا اُٹھا "کیا آپ مجھے بھی اُسی طرح ختم کر ڈالیں گے، جس طرح آپؑ نے گزشتہ رات اُس ظالم مصری کو مار ڈالا تھا؟"

اِس ہنگامہ آرائی اور شور و غوغا سے سارے بازار میں کھلبلی مچ گئی۔ رات کے سنّاٹے میں ہونے والے پُراسرار قتل کا مُعمّا حل ہو چکا تھا۔ یہ سنسنی خیز خبر پھیلتے پھیلتے شاہی محل تک جا پہنچی۔ محل میں ایک اعلیٰ سطح کا ہنگامی اجلاس مُنعقد ہوا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ موسیٰؑ کو فوراً گرفتار کر کے سرِعام پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔

موسیٰؑ کو اِن سب باتوں کی اِطلاع مل گئی۔ اُن کے پاس اَب اِس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ محل سے فرار ہو کر کسی محفوظ جگہ چُھپ کر جان بچائی جائے ——— (مسلسل)

اسپورٹس

# نیٹ بال

نیٹ بال لڑکیوں کا پسندیدہ کھیل ہے ۔ اس کو زیادہ لڑکیاں ہی کھیلتی ہیں ۔ نیٹ بال کی ٹیم سات کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے ۔

باسکٹ بال کے بعد، 1891ء میں ، یہ کھیل سب سے پہلے امریکا میں شروع ہوا ۔ اس کے بعد امریکا کے ڈاکٹر ٹولز نے لندن کا دورہ کیا اور وہاں "میڈم آسٹر برگ کالج آف فزیکل ٹریننگ" کی طالبات کو نیٹ بال کے قوانین سکھائے ۔ اِس سے پہلے وہاں نیٹ بال بغیر کسی قاعدے قانون کے کھیلا جاتا تھا اور حالت یہ تھی کہ ردی کی ٹوکریاں بطور گول استعمال کی جاتی تھیں ۔

نیٹ بال کے کھیل میں بھی گول اسکور کیے جاتے ہیں ۔ ہر ٹیم مخالف ٹیم کے خلاف گول اسکور کرتی ہے ۔ میچ کے دوران جو ٹیم زیادہ گول اسکور کرے ، وہ فاتح قرار پاتی ہے ۔ نیٹ بال کا میچ ایک گھنٹے کا ہوتا ہے ۔ پندرہ منٹ کے کھیل کے بعد پانچ مِنٹ کا وقفہ ہوتا ہے ۔ میچ کے 30 منٹ بعد ہاف ٹائم ہو جاتا ہے اور کھلاڑیوں کو آرام کے لئے 10 مِنٹ کا دوسرا وقفہ دیا جاتا ہے ۔ ہاف ٹائم کے وقفے کے بعد ٹیموں کی سائیڈیں تبدیل کر کے کھیل دوبارہ شروع کیا جاتا ہے اور پندرہ مِنٹ کے مزید کھیل کے بعد پانچ مِنٹ کا تیسرا وقفہ کر دیا جاتا ہے ۔

اِس تیسرے وقفے کے بعد کھیل اختتام تک جاری رہتا ہے ۔ بعض اوقات نیٹ بال کا کھیل 20,20 مِنٹ کے دو ہاف بنا کر بھی کھیلا جاتا ہے ۔

نیٹ بال کی ٹیم سات کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے ۔ ان کھلاڑیوں کی گراؤنڈ میں حسب ذیل پوزیشنیں ہوتی ہیں ۔

(1) گول کیپر (G.K) (2) گول ڈیفنس (G.D) (3) وِنگ ڈیفنس (W.D) (4) سنٹر (c) (5) وِنگ اٹیک (W.A) (6) گول اٹیک (G.A) (7) گول شُوٹر (G.S)

ہر کھلاڑی اپنی مخصوص پوزیشن پر کھیلتا ہے اور اُس کی شرٹ پر اُس کی پوزیشن کے مُخفّف حروف لکھے ہوتے ہیں تاکہ کوئی کھلاڑی اپنی پوزیشن چھوڑ کر کھیلے تو ریفری کو پتا چل سکے ۔

نیٹ بال کے میچ کو دو ریفری کنٹرول کرتے ہیں ۔ ہر ریفری اپنے ہاف میں کھیل کو کنٹرول کرتا ہے ۔ نیٹ بال کی گیند کا قطر تقریباً 9 انچ ہوتا ہے یعنی تقریباً فُٹ بال کی گیند کے برابر ۔

نیٹ بال کے گراؤنڈ کا فرش لکڑی یا سیمنٹ سے بنایا جاتا ہے ۔ ناہموار یا گھاس کی گراؤنڈ اِس کھیل کے لئے موزُوں نہیں ہوتی ۔ گراؤنڈ کی لمبائی 100 فُٹ اور چوڑائی 50 فٹ ہوتی ہے ۔ لمبائی کی طرف سے گراؤنڈ کو تین برابر حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ گراؤنڈ کے عین وسط میں 3 فُٹ قُطر کا ایک دائرہ لگایا جاتا ہے ۔ گراؤنڈ کے دونوں طرف ، گول لائن کے درمیان ، ایک ایک رِنگ پول ہوتا ہے ۔ یہ رِنگ ، جس میں گیند ڈالی جاتی ہے زمین سے 10 فُٹ بلند ہوتا ہے ۔ اِس رِنگ کا قُطر 15 انچ ہوتا ہے ۔ رِنگ کے ساتھ رسیوں کا ایک ایسا جال لگایا جاتا ہے جس کے منہ دونوں طرف سے کھلے ہوتے ہیں ۔

اِن رِنگ پولوں کے سامنے 16 فُٹ کا نِصف دائرہ کھینچا جاتا ہے ۔ دائرے کے اِس حِصّے کو شوٹنگ ایریا کہا جاتا ہے ۔ صِرف اِسی ایریے سے گیند کو گول میں ڈالا جاسکتا ہے ۔ اِس ایریے کے باہر سے گول کیا جائے تو وہ گول نہیں مانا جاتا ۔

نیٹ بال کے کھیل میں ہر کھلاڑی اپنی مخصوص پوزیشن پر کھیلنے کا پابند ہوتا ہے ۔ اگر کوئی کھلاڑی اپنی پوزیشن چھوڑ کر کسی دوسری پوزیشن پر کھیلے تو ریفری اُس کو فاؤل قرار دے دیتا ہے ۔

کھیل کا آغاز سنٹر میں سے دوسرے کھلاڑی کو پاس دینے سے ہوتا ہے ۔ جِس کھلاڑی کو پاس دیا جائے ، اُس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ تین سیکنڈ کے اندر اندر اگلے کھلاڑی کو پاس دے دے ۔

اِس طرح پاس کے ذریعے گیند گول شُوٹر تک پہنچایا جاتا ہے جو شُوٹنگ ایریا میں سے گیند کو گول میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے ۔ ہر ٹیم کے لئے گول کرنے سے پہلے کم از کم دو کھلاڑیوں کو پاس دینا لازمی ہوتا ہے ۔ اِس کھیل میں کھلاڑی گیند حاصل کر کے دوڑ نہیں سکتا ، صرف اپنے پاؤں پر گھوم کر دوسرے کھلاڑی کو پاس دے سکتا ہے ۔ اگر گیند سائیڈ لائن یا گول لائن سے باہر چلی جائے تو مخالف ٹیم کا کھلاڑی اُسی جگہ سے گراؤنڈ میں تھرو کرتا ہے ، جہاں سے گیند نے لائن عبور کی ہو ۔ گول ہونے جانے کی صورت میں درمیانی دائرے سے کھیل دوبارہ شروع کیا جاتا ہے ۔

(م - ا - ش)

# اور گڈُو میاں غائب ہو گئے

نیل کنول

سال میں بس ایک وُہی دِن خُوش قسمت ہوتا تھا جب گڈُو میاں بغیر کسی کے اُٹھائے، خُود ہی صُبح سویرے اُٹھ کر تیار ہو جاتے تھے۔ اور وہ دِن تھا 8 اکتوبر کا۔ اِسی دِن گڈُو میاں اِس دنیا میں تشریف لائے تھے۔

آج بھی اکتوبر کی آٹھ تاریخ تھی۔ چُناں چہ گڈُو میاں صُبح سویرے ہی تیار ہو گئے، اور چھلانگیں مارتے ہُوئے نیچے آ رہے تھے کہ زُنیرہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ گڈُو میاں کو پُوری اُمید تھی کہ زُنیرہ اُنھیں سال گرہ کی مُبارک باد دے گی، لیکن وہ اُن کا نوٹس لیے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگی اور پھر اُوپر سے اُس کی آواز آئی "گڈُو، اُٹھو۔ ناشتے کا وقت ہو گیا ہے"۔

گڈُو میاں نے حیرت سے اُسے اُوپر جاتے ہُوئے دیکھا اور پھر سر کھجاتے ہُوئے باورچی خانے کی طرف بڑھے۔

"السلامُ علیکم امّی، ابُو، زونا" اُنھوں نے بڑے جوش سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے "یہ زُنیرہ باجی اُوپر گئی ہیں، مجھے اُٹھانے۔ کہیں اُن کا دِماغ تو نہیں چل گیا؟"

امّی ڈش میں گرم گرم حلوا نکال رہی تھیں، ابُو ٹھنڈا ٹھنڈا جُوس گلاسوں میں ڈال رہے تھے اور زونا ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ کسی نے گڈُو میاں کی طرف دھیان نہیں دیا۔

"اُف! امّی۔ آپ نے کتنے مزے کا حلوا بنایا ہے" زونا بولی "زُنیرہ باجی اور گڈُو کو چاہیے، اب آ بھی جائیں"۔

"لیکن میں تو آ گیا ہُوں" گڈُو میاں زور سے بولے۔

اُسی وقت زُنیرہ اندر داخل ہُوئی۔ اُس کی سانس پھُولی ہُوئی تھی۔ بولی "گڈُو کہیں بھی نہیں ہے۔ میں نے اُسے ہر جگہ تلاش کر لیا ہے"۔

"آپ سب کو عینک کی ضُرورت ہے" گڈُو میاں کا پارہ چڑھنے لگا۔

"بُہت بے وقوف ہے وہ بھی۔ صُبح صُبح کھیلنے نکل گیا۔ اُسے پتا تھا کہ میں اُس کے لیے مزے دار حلوا بناؤں گی"۔

"شکریہ، امّی" گڈُو نے حلوا مُنہ میں ڈالتے ہُوئے کہا "سچ مُچ بُہت مزے دار ہے"۔

"آپ کھانا شروع کریں۔ میں اُسے ڈُھونڈ کر لاتی ہُوں" امّی بولیں

"امّی! امّی"! زونا چِلّاتی ہُوئی اُٹھ کھڑی ہُوئی "گڈُو کی کُرسی پر کوئی بُھوت بیٹھا حلوا کھا رہا ہے"۔

"اور ۔۔۔ اور یہ دیکھیے" زُنیرہ میز سے پرے ہٹتے ہُوئے بولی "جُوس بھی پی رہا ہے"۔

"کوئی بُھوت وُوت نہیں ہے" امّی نے کہا "گڈُو یہیں کہیں چھپا

ہمیں تنگ کر رہا ہے۔ مگر یہ کیا؟ جُوس کا گلاس آپ ہی آپ اُوپر اُٹھا اور آپ ہی آپ میز پر آ گیا! واقعی کوئی بُھوت ہے"! اب تو امّی بھی خوف زدہ ہو گئیں۔

"کیا مذاق ہے یہ"! ابّو جھلّا کر بولے۔

"آپ خُود دیکھ لیں" امّی نے کہا "گڈّو کا جُوس کسی بُھوت نے پی لیا ہے! اُس کی کُرسی پر کوئی بیٹھا ہے، جو ہمیں نظر نہیں آ رہا۔"

ابّو کُرسی سے اُٹھے اور گڈّو کا کان کھینچ کر بولے "ارے! سچ مُچ یہاں تو کوئی بیٹھا ہے"!

"کیا کر رہے ہیں آپ"؟ گڈّو میاں پریشان ہو گئے "مُجھے آرام سے کھانے بھی نہیں دیتے"۔

"اور دیکھو" ابّو گڈّو کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے "اِس بُھوت کے بال بھی گھنگھریالے ہیں۔ یہ تو بالکُل ہمارے گڈّو کی طرح ہے۔ آج کیا تاریخ ہے"؟

"آٹھ اکتوبر اور آج گڈّو کی نویں سال گرہ ہے۔ وہ ہمیں کئی دِنوں سے یاد دِلا رہا تھا" زُنیرہ نے بتایا۔

"ہُوں"! ابّو بڑے پُر اَسرار لہجے میں بولے "تو آج اُس کی نویں سال گرہ ہے۔"

"کیوں؟ کیا کوئی خاص بات ہے"؟ زُنیرہ نے گھبرا کر پُوچھا۔

"نویں سال گرہ!" امّی نے گہرا سانس لے کر ابّو کو دیکھا۔ ابّو نے

اُنھیں اِشارہ کیا۔ وُہ جلدی سے کاپی پنسل لے آئیں۔

ابّو نے کاپی پنسل گڈّو کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا "گڈّو بیٹا، اگر یہ تُم ہی ہو اور ہماری آواز سُن رہے ہو تو اِس پر کُچھ لِکھ دو"۔

گڈّو نے کاپی پر کُچھ لکھ دیا۔ زونا نے کاپی اُٹھا کر زور سے پڑھا "آپ سب پاگل تو نہیں ہو گئے"؟

"یہ تو گڈّو ہی لگتا ہے" زُنیرہ بولی "لیکن ہمیں نظر کیوں نہیں آ رہا"؟

"ہائے! میرا بیٹا"! امّی نے کُرسی پر گرتے ہوئے کہا "جب ہماری شادی ہُوئی تھی تو تُمھارے ابّو نے مجھے ایک فقیر کی بد دُعا کے بارے میں بتایا تھا"۔

"کون سی بد دُعا؟" زُنیرہ اور زونا نے ایک ساتھ پُوچھا

"یہ ایک بُہت پُرانی کہانی ہے" ابّو نے بتایا "اِسے سُن کر تُمھاری امّی اور میں بُہت ہنسے تھے، اور ہم نے اِس کا بالکُل یقین نہیں کیا تھا۔ تُمھیں بھی اِسی لیے نہیں بتایا کہ تم بھی یقین نہیں کرو گے"۔

"اچھا، خیر — اب بتا دیں" زونا بولی۔

"سُنو"! ابّو نے کہا "اب سے بُہت پہلے ہمارے کسی بُزرگ نے ایک پہنچے ہُوئے فقیر کی توہین کی تھی۔ اُس فقیر نے غُصّے میں آ کر اُنھیں بد دُعا دی اور وہ غائب ہو گئے۔ اِس کے بعد نہ تو کسی نے اُنھیں دیکھا اور نہ کبھی اُن کی آواز ہی سُنائی دی"۔

اِتنا کہ کر ابّو نے گہری سانس لی اور پھر بولے "اُس فقیر نے کہا تھا کہ اِس خاندان کی ہر تیسری نسل کا تیسرے نمبر کا بچّہ اپنی نویں سال گرہ پر ایسے ہی غائب ہو جائے گا"۔

"تو کیا آپ سچ مُچ مجھے نہیں دیکھ سکتے؟" گڈّو میاں پریشان ہو کر بولے۔

"ابّو، آپ مذاق تو نہیں کر رہے"؟ زونا رو دینے کو تھی "کیا واقعی اب ہم گڈّو کو نہیں دیکھ سکیں گے"؟

"کاش! یہ مذاق ہی ہوتا" ابّو ٹھنڈی سانس بھر کے بولے "لیکن ٹھہرو۔ ہمارے پاس اُس فقیر کی بد دُعا کو بے اثر کرنے کا ایک نُسخہ بھی تو تھا"۔ یہ کہ کر اُنھوں نے امّی کی طرف دیکھا۔

"ہاں، ہاں" امّی بولیں "اُس کی ایک نقل میری الماری میں رکھی ہے۔ جاؤ زونا، الماری میں سے نکال لاؤ۔ لیکن کیا وہ نُسخہ کار آمد ثابت ہو گا"؟

"شاید ہو جائے" ابّو نے کہا "لیکن آنٹی صفیہ اپنی نویں سال گرہ

پر غائب ہُوئی تھیں تو یہ نُسخہ کچھ کام نہ آیا تھا"۔

"اُف! میرے اللہ!! اب کیا ہو گا"! گڈّو نے کانپتے ہُوئے سوچا۔

"آنٹی صفیہ کے ساتھ کیا ہُوا تھا، ابُو"؟ زُنیرہ نے پُوچھا۔

"ہونا کیا تھا" ابُو بولے" جب اُن کی نویں سال گرہ کا دِن آیا تو وہ ایک دم غائب ہو گئیں۔ کسی کونے کُھدرے میں اکیلی پڑے پڑے مرکھپ گئی ہوں گی۔ ہائے! بے چاری"!

"یا اللہ! مجھے بچا"! گڈّو نے چلاّ کر کہا۔

"یہ لیجیے نُسخہ" زونا نے اندر آکر کہا" چلیے، میں ہی پڑھ کر سُناتی ہُوں۔" اُس نے کھانس کر گلا صاف کیا اور پھر پڑھنا شروع کیا"تین چمچے مچھلی کا تیل، پانچ چمچے کریلوں کا عرق۔۔۔"

زُنیرہ نے جھٹ مچھلی کے تیل کی شیشی اور کریلے نکال کر میز پر رکھ دیے۔ مچھلی کا تیل دیکھ کر گڈّو میاں کو اُبکائیاں آنے لگیں۔

"آگے بولو" امّی نے کہا۔

"مینڈک کا مغز ایک چھٹانک۔ چمگادڑ کا خُون دو چھٹانک۔۔"

"آخ تھو"! گڈّو میاں کا سارا کھایا پیا باہر آرہا تھا۔

"اِن سب چیزوں میں ایک کلو بُھوسا ملائیں۔۔۔"

"بُھوسا"! گڈّو میاں غُصّے سے بولے "کیا میں گدھا ہُوں؟"

یہ کہ کر وہ اُٹھے اور زونا کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔ اچانک باورچی خانے میں قہقہوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ زونا اور زُنیرہ پیٹ پکڑ کر فرش پر لیٹ گئیں۔ امّی اور ابُو کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے آنسو نکل آئے۔ گڈّو میاں نے حیرت سے پہلے اُنھیں دیکھا، پھر کاغذ پر نگاہ ڈالی۔ اُس پر موٹے موٹے حُروف میں لِکھا تھا:

برتھ ڈے فُول

"تو ——— تو کیا آپ مجھے دیکھ سکتے ہیں؟" گڈّو میاں نے پُوچھا:

امّی اور ابُو نے سر ہلا کر کہا "ہاں۔"

"تو کیا مجھے اب یہ فضُول چیزیں کھانی نہیں پڑیں گی"؟

"نہیں" امّی نے جواب دیا۔

"ہم بُہت دِنوں سے یہ ڈراما تیار کر رہے تھے" زُنیرہ نے ہنسی روکتے ہوئے کہا "ہم نے سوچا، اِس سال گرہ پر تُمھیں بے وقُوف بنایا جائے"۔

"اچھا، کوئی بات نہیں" گڈّو میاں کِھسیانے ہو کر بولے" میں بھی جلد ہی بدلہ لُوں گا"۔

"چلو، اب ناشتا کرو" امّی نے کہا" مجھے بازار جا کر سال گرہ کے لیے سامان لانا ہے۔ تُمھاری کتنی سہیلیاں آرہی ہیں، زُنیرہ؟"

"جی، چھ۔"

"اور تُمھاری، زونا"؟

"صِرف چار۔"

"اور بھئی، گڈّو میاں کی تو پُوری کلاس ہی آئے گی شاید" ابُو بولے "تحفوں کے ڈھیر لگ جائیں گے"۔

"اِن شاء اللہ" گڈّو میاں چہک کر بولے "میں نے سب کو بُلایا ہے۔ دو کیک لانا، خُوب بڑے بڑے۔ اور پیسٹریاں بھی اور سموسے بھی اور پھل بھی، اور اور بارہ مسالے کی چاٹ بھی"۔

"سب کچھ لاؤں گی، اپنے لال کے لیے" امّی ہنس کر بولیں۔

"واہ! ہیپی برتھ ڈے ٹو یُو" گڈّو میاں لہک لہک کر گانے لگے۔

"ٹُو یُو نہیں، ٹُومی" زُنیرہ بولی" تمہاری انگریزی بہت کم زور ہے۔" اور سب ہنسنے لگے۔

دماغ لڑاؤ

# داؤدی علمی آزمائش

1 ۔ ان دو بزرگانِ اسلام کے نام بتائیں جنہوں نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا؟

2 ۔ کس خلیفۂ راشد کے زمانے میں کوفہ دارالخلافہ بنا؟

3 ۔ بیعت سے انکار کرنے کے بعد حضرت امام حسینؑ مدینہ سے کہاں گئے تھے؟

4 ۔ امام حسینؑ کوفہ جانے کے لیے کیوں تیار ہو گئے تھے؟

5 ۔ حضرت امام حسینؑ نے کوفے کے حالات معلوم کرنے کے لیے کس کو کوفہ بھیجا تھا۔ اِن کا حضرت امام حسینؑ سے کیا تعلق تھا۔

6 ۔ جب کوفہ کے لوگوں نے امام حسینؑ کے نمائندہ کی بیعت کی اس وقت کوفہ کا گورنر کون تھا؟

7 ۔ اِس گورنر کو ہٹا کر کس کو کوفہ کا گورنر بنایا گیا تھا؟

8 ۔ کوفے کے نئے گورنر نے امام حسینؑ کے نمائندے سے کیا سلوک کیا؟

9 ۔ یہ بتائیے کہ کوفہ آج کل کس ملک میں ہے؟

10 ۔ کربلا کا واقعہ کس دریا کے کنارے پر پیش آیا؟

11 ۔ کوفہ کے نئے گورنر نے امام حسینؑ کے خلاف پہلا قدم کیا اُٹھایا تھا؟

12 ۔ کربلا کا واقعہ کس سِن ہجری میں پیش آیا؟

13 ۔ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کُل کتنے لوگ تھے؟

14 ۔ کوفیوں کے لشکر کی تعداد کتنی تھی؟

15 ۔ امام حسین علیہ اسلام کے خاندان میں کون سی ہستی زندہ رہی؟

## انعام پانے والے کامیاب دوست ماہ اگست 1989

قرعہ اندازی سے حسب ذیل بچّے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں

پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں ۔

شیخ وسیم الماس ، پتوکی ۔

دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں ۔

محمد دین ثاقب ، پتوکی ۔

تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں ۔

فقیر حسین بھٹّی ، پُرانی منڈی پتوکی ۔

پچّیس پچّیس روپے کی کُتب انعام پانے والے خُوش نصیب:

1 ۔ شیخ وقاص احمد ، پتوکی ۔
2 ۔ توصیف اشفاق ، کھاریاں ۔
3 ۔ محمد عاطف جمشید ، ملتان ۔
4 ۔ احمد شیراز صدیقی ، ملتان ۔
5 ۔ رفعت خان ، کلورکوٹ ۔
6 ۔ اشہد شاہین ، سیالکوٹ ۔
7 ۔ بابر کمال ، سیالکوٹ کینٹ ۔
8 ۔ عاصم فاران ، لاہور ۔
9 ۔ عاصمہ کنول گوندل ، ملتان ۔
10 ۔ عدیل ارشد ، سمن آباد ، لاہور ۔
11 ۔ احسن کامران ، کاچھوپورہ ، لاہور ۔
12 ۔ محمد اجمل حسن ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور۔
13 ۔ عمران ، لاہور کینٹ ۔
14 ۔ جمال عبدالناصر ، پنڈدادن خان ۔
15 ۔ سمیع اللہ ، اسلام آباد ۔
16 ۔ میمونہ روف ، پشاور حیات آباد ۔
17 ۔ شعیب الحسن ملک ، ملتان ۔
18 ۔ نادر شاہین ، سیالکوٹ ۔
19 ۔ نوخیز جاوید ، اسلامیہ پارک ، لاہور ۔
20 ۔ افتخار بھٹی ، صدر بازار لاہور کینٹ ۔
21 ۔ جہاں زیب ملک ، گوجرانوالہ ۔
22 ۔ آمنہ پرویز ، شیرانوالہ گیٹ ، لاہور ۔
23 ۔ میمونہ عزیز ، کھاریاں ۔
24 ۔ نبیل شاہین ، سیالکوٹ ۔
25 ۔ عطرت جعفری ، چکلالہ ، راولپنڈی ۔
26 ۔ اللہ دِتہ عطیل ، تحصیل کبیروالہ ۔
27 ۔ شیخ شیراز احمد ، راولپنڈی ۔
28 ۔ صدف شہزادی ، مغل پورہ ، لاہور ۔
29 ۔ مطاہر عبید خان ، بہاولپور ۔
30 ۔ خلیق الرحمان ، ملتان روڈ ، لاہور ۔
31 ۔ نعمان معظم احمد ، منگلا کینٹ ۔

---

جوابات ماہ اگست 1989

1 ۔ 14، اگست 1947
2 ۔ 20، فروری 1947
3 ۔ 11، جنوری 1946
4 ۔ 18، اپریل 1946
5 ۔ 22، اپریل 1942
6 ۔ جولائی 1947
7 ۔ جولائی 1946
8 ۔ 24، اگست 1946
9 ۔ خاکساروں پر گولی چل جانے کی وجہ سے جلوس نہیں نکلا ۔
10 ۔ یہ فیضانِ نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی
11 ۔ علامہ اقبالؒ مرحوم ۔
12 ۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم ۔
13 ۔ امرتسر کے تھے ۔ قبر اچھرہ لاہور میں ہے ۔
14 ۔ سر سکندر حیات خان ۔
15 ۔ ایک خواب کی بنا پر منیٰ میں ۔

---

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ اس کوپن کا بھیجنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر ہے۔

نام ________ عمر ________

پتا ________________

# فریکچر (ہڈّی ٹوُٹنا)

ڈاکٹر شاہد صدّیق

ہڈّی دو طریقوں سے ٹوٹ سکتی ہے۔ یہ مکمل طور پر ٹوٹ کر دو حصّوں میں تقسیم ہو سکتی ہے یا اُس میں صرف دراڑ پڑ سکتی ہے۔ یوں تو ہڈّی کے ٹوٹنے کے لئے کافی قوّت درکار ہوتی ہے اور جب تک کوئی چیز ہڈّی سے کافی زور سے نہ ٹکرائے یہ نہیں ٹوٹتی۔ لیکن بوڑھوں اور بچّوں کی ہڈّی بعض اوقات معمولی ضرب سے بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ ہڈّی عین اُس جگہ سے بھی ٹوٹ سکتی ہے جہاں پر ضرب لگی ہو اور اُس سے کچھ فاصلے پر بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ مثلاً کسی کی ٹانگ سے کوئی گاڑی ٹکرائے اور اُس کی ٹانگ کی ہڈّی ٹوٹ جائے یا کوئی اپنے ہاتھوں کے بَل گرے اور اُس کی ہتھیلی کی ہڈّی ٹوٹ جائے۔

بعض اوقات ہڈّی کے اردگرد کے مضبوط پٹھّے بھی ہڈّی کے ٹوٹنے کا باعث بنتے ہیں۔ جیسے اگر فُٹ بال کا کھلاڑی فُٹ بال کو کِک مارے اور کِک مِس ہو کر اُس کا پاؤں زمین سے ٹکرا جائے تو اُس کی ٹانگ کے اوپر والے حصّے کے مضبوط پٹھّے اُس کے گھٹنے کی چپنی توڑ سکتے ہیں۔ اِسی طرح اگر کِسی کا پاؤں گھوم جائے تو اُس کی ٹانگ کی ہڈّی نیچے سے ٹوٹ سکتی ہے۔

**فریکچر کی قسمیں:** فریکچر دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ (۱) اندرونی فریکچر (۲) بیرونی فریکچر

جب ہڈّی اِس طرح سے ٹوٹے کہ اِس کا کوئی حصّہ جسم سے باہر نہ آئے تو اِسے اندرونی فریکچر کہیں گے اور اگر ہڈّی جلد کو چیر کر باہر نکل آئے تو اُسے بیرونی فریکچر کہیں گے۔ دوسری قسم کا فریکچر زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ اِس سے ایک تو خون ضائع ہوتا ہے دُوسرے جراثیم بھی جسم میں داخل ہو جاتے ہیں جو زخم کو مزید خراب کر دیتے ہیں۔

**ہڈّی ٹوٹنے کی علامات:** اکثر جب کِسی کی ہڈّی ٹوٹے تو اُسے اِس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جِس جگہ سے ہڈّی ٹوٹے اُس جگہ درد ہوتا ہے اور اُس جگہ کو ہلانے سے درد زیادہ ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جگہ سُوج جاتی ہے اور اُس کا رنگ نیلا پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات جس جگہ کی ہڈّی ٹوٹی ہو وہ جگہ ٹیڑھی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر بازو کی ہڈّی ٹوٹے تو بازو ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔

**ابتدائی طبّی امداد:** سب سے پہلے اِس بات کا خیال رکھیں کہ اگر آپ کے کِسی ساتھی کو چوٹ لگ جائے اور خدشہ ہو کہ اِس کی ہڈّی ٹوٹ گئی ہے تو گھبرائیں نہیں۔ مریض کے ارد گرد بھیڑ نہ لگائیں۔ اُسے کھلی ہوا لگنے دیں، اُسے تسلّی دیتے رہیں اور اُس کو پانی پلائیں۔ اُس کی قمیص وغیرہ کے بٹن کھول دیں تاکہ اُسے سانس لینے میں دِقت نہ ہو۔

اِس کے بعد دیکھیں کہ فریکچر کِس قسم کا ہے اندرونی ہے یا بیرونی۔ اگر فریکچر اندرونی ہے اور ہڈّی جسم سے باہر نہیں نِکلی ہے تو نہایت آرام سے ٹُوٹی ہوئی ہڈّی والے حصّے کو کم سے کم ہلاتے ہوئے اُس کے گِرد لمبائی کے رُخ لکڑی کی دو چپٹیاں رکھ دیں اور پھر اُن کے گِرد کپڑے کی پٹّیاں کَس کے باندھ دیں۔ خیال رہے کہ پٹّی اتنی کَس کے نہ بندھے کہ خون کی گردش میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد آرام سے مریض کو ہسپتال لے جائیں۔ اگر فریکچر بیرونی ہے اور جِلد پھٹ کر ہڈّی باہر نِکل آئی ہے تو پھر مندرجہ ذیل اقدامات اِسی ترتیب سے کریں۔

(1) سب سے پہلے زخم کے اِرد گرد کے حصّے کو انگوٹھوں سے تھوڑی دیر دبا کر رکھیں تاکہ خون نکلنا بند ہو جائے۔
(2) اس زخم کے اوپر ایک صاف کپڑے کی پٹّی رکھ دیں۔
(3) ایک دوسری پٹّی کا رِنگ بنائیں جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے اور اِس کو ہڈّی کے اوپر اِس طرح رکھیں کہ باہر نکلی ہوئی ہڈّی، کپڑے کے رنگ کے اندر والی خالی جگہ میں آئے۔
(4) پھر اِس کے اوپر ایک پٹّی کَس کے باندھ دیں۔ اگر زخم بازو میں ہو تو بازو کو گردن کا سہارا دیں تاکہ اس میں سُوجن کم سے کم پڑے۔ اِس کے بعد مریض کو ہسپتال لے جائیں۔

اگر صرف جلد پھٹی ہے اور ہڈّی باہر نہیں آئی تو زخم کے اردگرد کی جگہ کو انگوٹھوں سے تھوڑی دیر کے لئے دبائیں تاکہ خون رُک جائے۔ پھر زخم کے اوپر ایک صاف پٹّی رکھ کے اُس کے اوپر پٹّی باندھ دیں اور بازو کو کم سے کم حرکت دے کر مریض کو ہسپتال پہنچا دیں۔

یاد رکھیں کہ آپ ٹوٹی ہوئی ہڈّی والے حصّے کو جتنا کم سے کم ہلائیں گے اتنا ہی فریکچر کم خراب ہو گا اور مریض کو تکلیف بھی کم ہو گی۔

## آئیے، مُسکرائیں

* عورت (لنگڑے فقیر سے) لنگڑا ہونا بھی کتنے افسوس کی بات ہے ۔ پھر بھی خُدا کا شُکر کرو ۔ اگر تُم اندھے ہوتے تو یہ اور بھی زیادہ افسوس کی بات ہوتی ۔

فقیر: کیا بتاؤں بی بی جی ۔ جب میں اندھا تھا تو لوگ کھوٹے سکّے دے جایا کرتے تھے ، اِس لیے لنگڑا بننا پڑا (قیصر افضال کراچی)

* پوتا: داداجان ، آج آپ بُہت خوش نظر آرہے ہیں ۔

دادا: ہاں بیٹا ۔ جب میں تُمہاری عُمر کا تھا تو میں نے ایک کہانی تعلیم و تربیت میں چھپنے کے لئے بھیجی تھی ۔

پوتا: پھر کیا ہوا؟

دادا: اِس مہینے وہ چھپ گئی ہے ۔ (دُردانہ بنتِ غازی سکّھر)

* ایک قصبے کے قبرستان کی چاردیواری گر گئی ۔ لوگوں نے اُسے بنوانے کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ سب لوگوں نے چندہ دیا ، سوائے ایک شخص کے ۔ لوگوں نے اُس سے کہا "بھئی ، آپ بھی کچھ دیں"۔

وہ بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا ، قبرستان کے گرد چاردیواری بنانے کی کیا ضرورت ہے ۔ جو لوگ اُس کے اندر ہیں ، وہ باہر نہیں نکل سکتے اور جو باہر ہیں ، وہ اندر نہیں جانا چاہتے ۔ (نسیم منہاس کراچی) ۔

* ایک دفعہ ایک بادشاہ کی شان میں کسی شاعر نے قصیدہ لکھا ۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اسے ایک مریل گھوڑا انعام میں دے دیا ۔ شاعر گھوڑے پر سوار ہو کر جانے لگا تو بادشاہ نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

شاعر نے جواب دیا "حضُور ، جُمعے کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں" ۔

بادشاہ نے حیران ہو کر کہا "لیکن آج تو اتوار ہے" ۔

شاعر نے جواب دیا "حضُور ، آپ نے ٹھیک فرمایا ۔ لیکن اس گھوڑے پر بیٹھ کر جامع مسجد پہنچنے میں ایک ہفتہ لگ جائے گا" ۔

* لڑکا: (ڈاکٹر سے) کیا آپ کے پاس درد کی دوا ہے"؟

ڈاکٹر: "درد کہاں ہے"؟

لڑکا: "جی ابھی تو نہیں ہے ۔ آدھ گھنٹے بعد ہو گا ، جب ابُّو میرا رزلٹ کارڈ دیکھیں گے" ۔ (توفیق سجاول اسلام آباد)

* کرائے دار نے مالکِ مکان سے کہا: "یہ چھت ٹوٹی ہوئی ہے ۔ اِس کی مرمّت کرا دیں"۔

مالکِ مکان نے پوچھا "آپ کو یہ احساس کب ہوا کہ چھت ٹوٹی ہوئی ہے؟"

کرایہ دار بولا "کل جب بارش ہو رہی تھی تو میں چھت کے نیچے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا سُوپ پی رہا تھا ۔ سوپ ختم ہونے میں تین گھنٹے لگے" ۔ (عدیل ارشد سمن آباد لاہور)

* ایک پروفیسر صاحب سے اُن کی بیوی نے کہا "اجی، آپ نے کُچھ سُنا؟ ہمارا مُنّا اب چلنے لگا ہے"۔

پروفیسر بولے "کب سے؟"

بیوی نے کہا "آٹھ دن ہو گئے"۔

پروفیسر صاحب گھبرا کر بولے "اور تم اب بتا رہی ہو؟ اب تو وہ بہت دُور نکل گیا ہو گا" ۔ (عرفان محمُود نارتھ ناظم آباد کراچی)

* مُلازم نے مالک سے کہا "میں پانچ سال سے ملازم ہوں اور میں نے ہمیشہ تین آدمیوں کا کام کیا ہے ۔ کیا آپ میری تنخواہ نہیں بڑھائیں گے"؟

مالک نے جواب دیا "میں خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا ۔ مجھے اُن دو آدمیوں سے بھی مشورہ کرنا ہو گا جن کا تم کام کرتے رہے ہو" ۔ (مسعُود احمد قُریشی خانیوال) ۔

* ماسٹر صاحب نے لڑکے سے پوچھا "بتاؤ انیس ، ہاتھی اور مکّھی میں کیا فرق ہے"؟

انیس نے جواب دیا "ہاتھی کے سُونڈ ہوتی ہے اور مکّھی کے نہیں"۔

دوسرے لڑکے سے پوچھا تو اس نے جواب دیا "ہاتھی کے پَر نہیں ہوتے ۔ مکّھی کے پَر ہوتے ہیں"؟

تیسرے لڑکے سے پوچھا تو وہ کہنے لگا "ماسٹر صاحب، سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ مکّھی ہاتھی پر تو بیٹھ سکتی ہے ، ہاتھی مکّھی پر نہیں بیٹھ سکتا" ۔ (فریحہ ظہیر اسلام پورہ لاہور)

* * * *

## آیئے دوست بنائیں

محمد اسلم خالد 15 سال
کرکٹ ، باغبانی ، تعلیم و تربیت پڑھنا۔
شہزاد آباد ، چک نمبر 165/E.B
تحصیل عارف والا ضلع ساہیوال

فضل احمد خانی 14 سال
اخبارات و رسائل میں لکھنا
فضل نیوز ایجنسی
اقصیٰ چوک ربوہ

محمد عتیق الرحمن 8 سال
فٹ بال کھیلنا ، مطالعہ کرنا
242/c سٹلائٹ ٹاؤن
رحیم یار خان ۔

آصف حسین 13 سال
ٹکٹ جمع کرنا ، مطالعہ
مکان نمبر 632 ۔ میاں غلام رسول
کالونی ، صادق آباد

انوار الحق چوہدری 16 سال
مطالعہ ، باڈی بلڈنگ
اتحاد کالونی علامہ اقبال
ٹاؤن ، لاہور ۔

محمد احمد جاوید 15 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا ، کرکٹ
کارنر کچہری بازار
نزد یو ۔ بی ۔ ایل اوکاڑہ

محمد ریاض 16 سال
قرآن پاک کی قرأت
معرفت محمد ریاض جیولرز
کچہری بازار اوکاڑا

فیصل یوسف خان 14 سال
ٹکٹ جمع کرنا ۔
43/A میر فضل ٹاؤن یونٹ 9
حیدر آباد سندھ

حیدر علی 15 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
زینب بلڈنگ فلیٹ نمبر 5 بی ۔ ایس 13
بلاک 1 فیڈرل بی ایریا کراچی

محمد جاوید نور 16 سال
قلمی دوستی ، مطالعہ
معرفت نور محمد محلہ عالم گیر پارک
مکان نمبر 43-S-16 ملتان روڈ لاہور

شیخ محمد اعجاز 13 سال
ٹکٹ جمع کرنا ۔ کرکٹ
مکان نمبر 1195 گلی گورنمنٹ
گرلز ہائی سکول ، حافظ آباد ۔

افتخار بھٹی 13 سال
کرکٹ ، مطالعہ
گلی نمبر 73 مکان نمبر 36/680
بزار محلہ صدر لاہور کینٹ

محمد ندیم صدیقی 15 سال
کرکٹ ، تعلیم و تربیت پڑھنا
معرفت محمد ابراہیم مکان نمبر 22
گلی نمبر 43 ، لاہور

راشد قمر 14 سال
قلمی دوستی ، ٹکٹ جمع کرنا
1520 – c پیپلز کالونی نمبر 2
فیصل آباد

حافظ محمد یعقوب تابانی 14 سال
قلمی دوستی ، کہانیاں لکھنا ، قرأت
5 ۔ رسول پورہ
حافظ آباد روڈ گوجرانوالہ

محمد شاہد توکیروی 14 سال
ٹکٹ جمع کرنا ۔
معرفت طاہر بک ڈپو جامع
مسجد روڈ ہارون آباد

سید کاشف سردار 12 سال
مطالعہ ، ماچس جمع کرنا
مکان نمبر 276 ۔ آئی 10/2
اسلام آباد

عامر سلطان رانا 11 سال
ٹکٹ اور سکے جمع کرنا ، پیانو بجانا
9 ۔ بی ۔ بہاول پور
ہاؤس ، لاہور

محمد اعظم گلشن 14 سال
کہانیاں پڑھنا
ضلع گجرات تحصیل پھالیہ
ڈاک خانہ خاص رسول ۔

محمد فیاض 14 سال
کراٹے
کوٹھی نمبر 1025
آئی ۔ 10 اسلام آباد ۔

امتیاز حسن خان 14 سال
مطالعہ
پی ۔ 712 ، بلاک ۔ این
نارتھ ناظم آباد کراچی ۔

عمران خلیل 14 سال
کرکٹ ، تعلیم و تربیت پڑھنا
تھانہ روڈ
کاموں کے ضلع گوجرانوالہ

عبدالحفیظ بھٹو 16 سال
کرکٹ ، تعلیم و تربیت پڑھنا
معرفت عبدالقیوم زرگر
ڈہرکی ضلع سکھر سندھ

آیئے دوست بنائیں
ستمبر : 1989

قلمی دوستی کی اس محفل میں شریک ہونے کے لیے یہ کوپن پُر کرنا اور تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں ۔)

نام ________ عمر ________
مشاغل ________
پتا ________
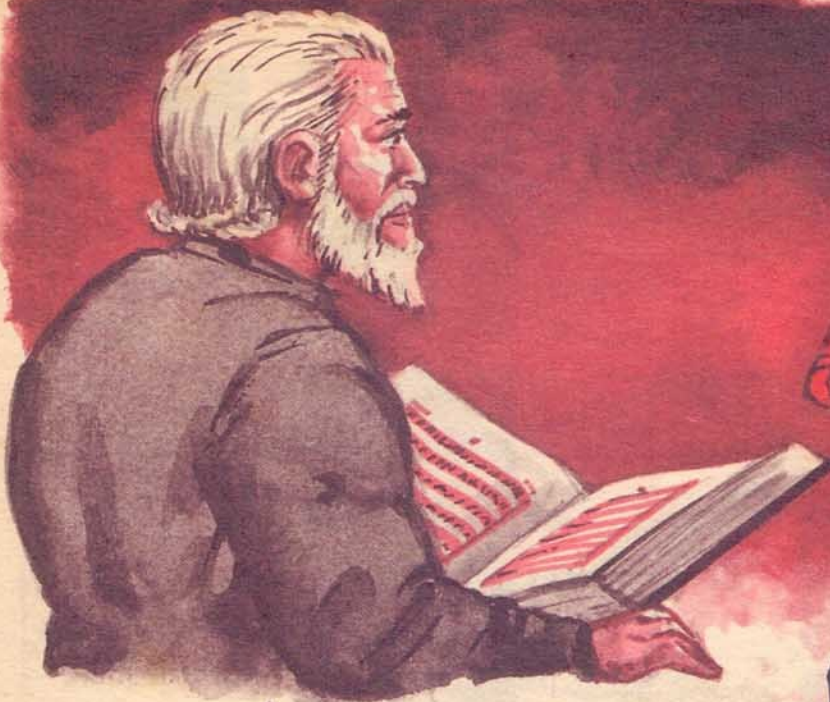
مقبول انور داؤدی

# درویش اور بادشاہ

حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے

کہتے ہیں کہ سکندرِ اعظم کے زمانے میں ایک درویش حکیم دیوجانس کلبی تھا وہ سمندر کے کنارے ریت پر لیٹا ہوا دُھوپ سینک رہا تھا کہ سکندر اس کے پاس گیا اور پوچھا "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں" کلبی نے کہا "مہربانی کر کے دھوپ چھوڑ دیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ بڑے بڑے بادشاہ فقیروں کے دربار میں بڑی عاجزی سے حاضر ہوتے رہے۔ جلال الدین اکبر اعظم پا پیادہ چل کر حضرت سلیم چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہجہاں نے دہلی سے چل کر لاہور میں حضرت میاں میر صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت اقبال اسی لئے تو فرماتے ہیں۔

مقامِ فقر ہے کتنا بُلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہئیے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

نہ پوچھ اِن خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ اِن کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ہم آپ کو ایک ایسے ہی درویش کا واقعہ سناتے ہیں۔ یہ بزرگ حضرت مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ (داتا گنج بخشؒ) کے مُرشد تھے۔ ان کا اسم گرامی خواجہ ابوالحسن خُرقانی تھا۔ اُس وقت مسلمان بادشاہوں کا قاعدہ تھا کہ جب وہ تخت پر بیٹھتے تو مسلمان رعایا سے بیعت لیتے۔ اسی طرح دنیا کا عظیم فاتح سُلطان محمود غزنوی جب تخت پر بیٹھا تو سب نے اُس کی بیعت کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ فلاں مقام پر ایک بزرگ خواجہ ابُوالحسن خُرقانیؒ رہتے ہیں، انہوں نے ابھی تک بیعت نہیں کی۔

سلطان محمود غزنوی کو جب یہ علم ہوا تو اس نے اپنے مُنشی کو حکم دیا کہ اِن بزرگ کو قرآنِ مجید کی وہ آیت لکھ کر بھیجو جس کے معنی ہیں کہ "اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اس حاکم کی اِطاعت کرو جو تم میں سے ہو۔

شاہی ہرکارہ جب سُلطان کا خط لے کر خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ کی خدمت میں پہنچا اور قرآن حکیم کی آیت والا رُقعہ پیش کیا تو انہوں نے اس پر یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ ابھی تک تو میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں مصروف ہوں۔ اس سے فارغ ہو لُوں تو آپ کی طرف توجّہ کروں گا۔

سلطان محمود غزنوی کو خواجہ صاحب کا یہ جواب موصول ہوا تو اُسے پہلے تو غصہ آیا، پھر سوچا کہ اِن بزرگ کی خدمت میں خود جا کر حاضری دُوں گا۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنے غلام ایاز کو اپنا شاہی لباس پہنا دیا اور خود ایاز کا لباس پہن کر خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ خواجہ صاحب نے سُلطان کی طرف دیکھ کر کہا "محمود! درویشوں کا امتحان نہیں لینا چاہیئے"

سُلطان محمود غزنوی کچھ دیر خواجہ صاحب کی خانقاہ میں رہا اور مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر اشرفیوں کی ایک بھری ہوئی تھیلی خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کی۔

خواجہ صاحب نے فرمایا "محمود! یہ تھیلی اٹھا لو فقیر کو شاہی دولت کی ضرورت نہیں ہوتی" جب محمود نے زیادہ اصرار کیا تو خواجہ صاحب نے ایک خادم کو اشارہ کیا کہ لنگر خانے سے باسی روٹی کا ایک ٹکرا لے آؤ۔ خادم لنگر سے روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُٹھا لایا۔ خواجہ صاحب نے وہ ٹکڑا محمود کو دیتے ہوئے کہا کہ ہمارا یہ تبرّک کھاؤ محمود نے وہ سوکھا ہوا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا لیکن وہ اتنا سخت تھا کہ نہ تو وہ اس کے دانتوں سے ٹوٹتا اور نہ ہی گھلتا۔ اُس نے بڑی کوشش کی کہ اُس لقمے کو چبا لے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس پر خواجہ صاحب نے فرمایا "محمود! فقیر کا ٹکڑا حلق سے نہیں اُترتا؟" محمود نے جواب دیا "حضرت! کوشش کر رہا ہوں" خواجہ نے فرمایا "جس طرح فقیر کا ٹکڑا بادشاہ کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا، اسی طرح بادشاہ کی دولت فقیر کے حلق سے نیچے نہیں اُتر سکتی"۔

محمود فقیر کے جلال سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ جب رخصت مانگی تو ساتھ ہی ایک سوال کر دیا کہ اپنا کوئی تبرّک عنایت کیجئے۔ خواجہ صاحب نے اپنا ایک کُرتا محمود کو دیتے ہوئے فرمایا کہ اِس کُرتے کے وسیلے اللہ سے اپنی ذاتی غرض کے لیے کچھ نہ مانگنا۔ محمود تبرّک لے کر واپس آگیا۔

سُلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ کامیاب حملے کئے اُس کا آخری حملہ بحیرۂ عرب کے کنارے کاٹھیاواڑ میں سومنات کے مندر پر تھا۔ سومنات کا راستہ بڑا کھٹن اور مشکل تھا۔ پھر یہ مندر سارے ہندوستان کے بُت پرستوں کا سب سے بڑا مندر تھا۔

جب ہندوستان کے راجاؤں کو محمود غزنوی کے سومنات پر حملہ کرنے کا پتا چلا تو وہ اپنے جھگڑے ختم کر کے سومنات کو بچانے کے لئے جمع ہو گئے۔ محمود ملتان سے صحرائے راجپوتانہ کو پار کر کے سومنات پہنچا تھا۔ یہ بڑا دشوار گزار راستہ تھا۔ سب سے بڑی دِقت پانی کی تھی۔ لیکن محمود غزنوی نے ان تمام مشکلوں پر قابو پاتے ہوئے صحرائے راجپوتانہ کو عبور کر لیا، اب سومنات کا مندر اس کے سامنے تھا۔

بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ہندو فوج نے جو قلعہ بند تھی، مسلمانوں پر زبردست حملے کیے۔ سومنات کو فتح کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی۔ غیر ملک، نہ خوراک نہ پانی اور نہ کمک۔ اب محمود کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے اللہ کے حضور جھک جائے۔

اُس نے وضو کر کے نفل ادا کیے اور خواجہ صاحب کے عطا کردہ کُرتے کو وسیلہ بنا کر پروردگار سے گڑگڑا کر دعا کی کہ اے اللہ! ہم کو کامیابی عطا کر۔ نفلوں سے فارغ ہو کر جب وہ اُٹھا تو اس کے اندر شہادت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اُس نے اپنی فوج سے کہا "زندگی یا موت! اٹھو اور سومنات پر قبضہ کر لو۔" اُس کی فوج نعرۂ تکبیر بلند کرتی ہوئی، کمندیں ڈال کر قلعے کی دیوار پر چڑھ گئی اور سومنات پر قبضہ کر لیا۔

محمود نے گرز اٹھایا کہ سومنات کے بُت کے ٹکڑے کر دے۔ اس پر ہندو راجا پنڈت اور پُجاری اُس کے قدموں میں گر گئے کہ جتنی دولت مانگو ہم دینے کو تیار ہیں مگر ہمارے بُت کو نہ توڑو، مگر محمود نے یہ کہتے ہوئے کہ:

"میں بُت فروش کے بجائے بُت شکن کہلانا زیادہ پسند کرتا ہوں"

ایک ہی وار میں سومنات کے بُت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

## آپ کا خط ملا

کہانیوں میں بے وقوف لومڑ اور آنٹی مونیکا پسند آئیں ۔ اِسکے علاوہ نعت بھی بہترین تھی ۔ لطیفوں کی جگہ کہانی بے شک اچھی تھی مگر لطیفوں کی کمی بہرحال محسوس ہوئی ۔ آپ کو چاہیئے کہ لطائف کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں ۔ قسط وار ناول "انگوٹھی کہاں گئی" کی صرف ایک قسط ہی شائع کیا کریں ۔ (رابعہ انصاری کراچی)

اگست کے شمارے کا سرورق متأثر نہ کر سکا مگر کہانیاں لاجواب تھیں ۔ سب پسند آئیں ۔ "دماغ لڑاؤ" کے سوالات کچھ آسان کر دیں ۔ بہت مشکل ہوتے ہیں ۔ (شمائلہ برلاس ۔ ڈیرہ اسماعیل خان)

اگست کا چمکتا دمکتا رسالہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیوں میں "انگوٹھی کہاں گئی"، "آنٹی مونیکا" اور "بے وقوف لومڑ" بہت پسند آئیں ۔ "کیوں اور کیسے" بھی بہت اچھا سلسلہ ہے ۔ (مریم رانی مبارک ، سیالکوٹ)

یکم اگست کو ہم نے اپنے محبوب رسالے کی پہلی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی ۔ اس لیے کہ ہمیں اپنا محبوب رسالہ خریدتے ہوئے ایک سال گزر گیا ہے ۔ اس مہینے کی کہانیوں میں ایک بہادُر عورت ، کتنا سُہانا تھا وہ زمانہ اور آنٹی مونیکا بہت پسند آئیں ۔ معلوماتی مضمون کیون اور کیسے بھی پسند آیا ۔ (فوزیہ قادری ، ملتان) ۔

کہانیوں میں ایک بہادُر عورت ، سرزنش ، کتنا سہانا تھا وہ زمانہ ، کانٹے والا اور بے وقوف لومڑ بہت بہت پسند آئیں ۔ آپ داؤدی علمی آزمائش کو ختم کر دیں کیونکہ تمام بچّوں کے ذہن اتنے تیز نہیں ہوتے کہ انہیں اتنی معلومات یاد ہوں ۔ (سعدیہ مُشتاق اسلام آباد) ۔

سرورق اچھا تھا۔ جناب میرزا ادیب کی کہانی "ایک بہادُر عورت" پسند آئی ۔ کانٹے والا ، بے وقوف لومڑ اور کتنا سہانا تھا وہ زمانہ بھی قابلِ ذکر تحریریں تھیں ۔ کیا ہی اچھا ہو کہ "انگوٹھی کہاں گئی" کو آپ مختصر کر دیں ۔ تاریخی کہانی "شیر شاہ سوری" اچھی جا رہی ہے ۔ (علی رضا خان ، نارتھ کراچی)

اس ماہ کا تعلیم و تربیت بہت ہی شاندار تھا ۔ تمام کہانیاں ایک سے ایک بڑھ کر تھیں ۔ (چودھری محمد اسلم کاہلوں ، جنڈیالہ ڈھاب والا)

سرورق سے لے کر آخر تک ہر چیز عُمدہ تھی ۔ "انگوٹھی کہاں گئی" بہترین ناول ہے ۔ باقی کہانیاں بھی معیاری تھیں ۔ داؤدی عِلمی آزمائش کو ختم کر کے کوئی اور مُقابلہ شروع کیا جائے کیونکہ یہ بہت مُشکل ہوتا ہے اور بغیر کسی بڑے کی مدد کے حل نہیں ہو پاتا ۔ "وائلڈ لائف" اور "ہونہار مُصوّر" اچھے سلسلے ہیں ۔ (ثروت لیاقت ، وسن پورہ لاہور)

علمی آزمائش کی جگہ کوئی اور مقابلہ شروع کریں تو بہت نوازش ہو گی کیونکہ اس میں پوچھے جانے والے سوالات ایف اے اور بی اے کی کتابوں ہی میں مل سکتے ہیں اور جو بچّے انعام حاصل کرتے ہیں وہ یقیناً کسی کی مدد سے سوالات حل کرتے ہیں ۔ (فوزیہ بتول بھٹّی ، راولپنڈی)

کہانیوں میں ایک بہادُر عورت ، کتنا سہانا تھا وہ زمانہ ، کانٹے والا اور آنٹی مونیکا بہت پسند آئیں ۔ آپ سے گزارش ہے کہ "داؤدی علمی آزمائش" میں آسان سوال دیا کریں ۔ (کاشفہ خاتون، کراچی)

کہانی سرزنش بہت عمدہ تھی ۔ کتنا سہانا تھا وہ زمانہ بھی بہت پسند آئی ۔ کانٹے والا ، بے وقوف لومڑ ، آنٹی مونیکا بھی بہت اچھی تھیں ۔ لطیفے ختم کر کے اچھا کیا ۔ (وجیہہ چغتائی ، لاہور)

تمام کہانیاں لاجواب تھیں ۔ سرورق بھی بہت شاندار تھا۔ جناب اے حمید صاحب کی کہانی انگوٹھی کہاں گئی نے بہت متأثر کیا جبکہ معلوماتی مضمون خُردبین اور کیوں اور کیسے بہت اچھی تحریریں تھیں ۔ آپ نے لطائف کی جگہ کہانی شروع کر کے بہت اچھا کیا ہے ۔ (فضل احمد فانی ، ربوہ)

کہانیوں میں ایک بہادر عورت ، کتنا سہانا تھا وہ زمانہ ، بے وقوف لومڑ اور آنٹی مونیکا بہت پسند آئیں ۔ (عنبر مبارک علی سیالکوٹ)

ایک بہادُر عورت نے بہت متأثر کیا۔ سرزنش ، ننھا موسیٰ ، کتنا سُہانا تھا وہ زمانہ ، انگوٹھی کہاں گئی ، کانٹے والا ، بے وقوف لومڑ ، آنٹی مونیکا بھی بہت پسند آئیں ۔ (وقار مہدی ، پکّی شاہ مردان)

سرورق بے حد پسند آیا۔ کہانیوں میں ایک بہادر عورت، تنہا موسیٰ نیل کی موجوں پر، سرزنش، آنٹی مونیکا بہت اچھی تھیں۔ (راحیلہ جمیل، جھنگ)

بہادر عورت، سرزنش، بے وقوف لومڑ کہانیاں اچھی تھیں۔ مگر کانٹے والا اس دفعہ تمام کہانیوں سے زیادہ دلچسپ تھی۔ (محمد مسعود چیچیاں، میرپور آزاد کشمیر)

سرورق کی تصویر بہادری، ہمدردی اور قربانی کا درس دے رہی تھی۔ سرزنش آزادی کے حوالے سے متاثر کُن تحریر تھی۔ انگوٹھی کہاں گئی، کانٹے والا اور قرآنی کہانی اچھی کاوشیں ہیں۔ کیوں اور کیسے بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رکھا جائے۔ (اللہ دتہ عطیل، بستی سکھائی والا)

کہانیوں میں، ایک بہادُر عورت، سرزنش، کتنا سہانا تھا وہ زمانہ، کانٹے والا، بے وقوف لومڑ اچھی تھیں۔ لطیفے بند کر کے آپ نے اچھا کیا۔ (شعیب الحسن، مُلتان)

سرزنش، کتنا سہانا تھا وہ زمانہ، بیوقوف لومڑ اور ایک بہادر عورت کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ اے حمید کا ناول انگوٹھی کہاں گئی اچھا جا رہا ہے۔ کیوں اور کیسے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ (سیّد اصغر علی شاہ بخاری، لانڈھی کراچی)

سرورق لاجواب تھا۔ تمام کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ یہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ اس شمارے میں لطیفے نہیں ہیں۔ ہمیں لطیفے بہت اچھے لگتے ہیں۔ (احمد گل انجم، لکی مروت)

سرورق بہت خوب صورت تھا۔ کہانیاں ساری معیاری تھیں۔ داؤدی علمی آزمائش یا تو ختم کریں یا سوال آسان کریں۔ (عاصمہ خورشید، بہاولپور)

سرورق دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ کہانیوں میں انگوٹھی کہاں گئی، بہادر عورت، کتنا سہانا تھا وہ زمانہ اور کانٹے والا بہت پسند آئیں۔ (سعدیہ امین اوکاڑا کینٹ)

اگست کا پرچہ اچھا تھا مگر اس میں لطیفے نہیں تھے۔ آخر کیوں؟ ایک بہادر عورت، سرزنش، انگوٹھی کہاں گئی، کانٹے والا اچھی کہانیاں تھیں۔ داؤدی علمی آزمائش کے سوالات آسان کر دیں۔ آنٹی مونیکا بھی اچھی کہانی تھی۔ (میمونہ رؤف، حیات آباد پشاور)

سرورق خوب صورت تھا۔ کانٹے والا کہانی بہت پسند آئی۔ اِس کے علاوہ کتنا سہانا تھا وہ زمانہ، بیوقوف لومڑ، سرزنش، بہادُر عورت بھی پسند آئیں۔ آنٹی مونیکا کہانی بہت دلچسپ اور مزاحیہ تھی۔ گزارش ہے کہ داؤدی علمی آزمائش آسان کر دیں یا پھر ختم کر دیں۔ اِس کے سوالات اتنے مشکل ہوتے ہیں کہ ایم اے کا طالبِ علم بھی جواب نہیں دے سکتا۔ (عمارہ صدیق لاہور)

سرورق کے کیا کہنے۔ کہانیاں کانٹے والا، آنٹی مونیکا، سرزنش اور ایک بہادُر عورت پسند آئیں۔ (صبا زیدی لاہور چھاؤنی)

کہانیوں میں ایک بہادُر عورت، کتنا سہانا تھا وہ زمانہ، بے وقوف لومڑ اور کانٹے والا پسند آئیں۔ انگوٹھی کہاں گئی بھی اچھی چل رہی ہے۔ داؤدی علمی آزمائش میں سوال آسان کر دیں۔ (سچندہ مُمتاز، پشاور)

تمام کہانیاں اور مضمون بہت اچھے تھے۔ کہانیوں میں آنٹی مونیکا، سرزنش اور ایک بہادر عورت بہت پسند آئیں (شاہدہ عامر، پاکپتن)

اِن بچّوں کے خط جگہ نہ ہونے کی وجہ سے شائع نہ ہو سکے:

شہلا ریاض، سائدہ کلاں لاہور۔ سارہ الیاس ڈار اسلام آباد۔ محمد اسلم، شاہ نواز بھٹو کالونی کراچی۔ محمد نعیم احمد نیو اڈا مردان۔ محمد اکرم بزدار ڈی جی خان۔ محمد مظہر ہاشمی ملتان۔ محمد اظہر بلوچ ملتان۔ حارث لطیف ساہیوال۔ مختار احمد سوڈیوال لاہور۔ ارسلان جلیل حیدر آباد۔ ثمینہ ملک صدر بازار کراچی۔ ثروت مبارک سیالکوٹ۔ تزئین مسعود رحمان آباد راولپنڈی۔ خُرم شہزاد گوجر خان۔ عبداللہ عبید ملیر ہالٹ کراچی۔ فیصل عبدالستار کھارادر کراچی۔ کامران سرور فیصل آباد۔ نعیم افضل اسلام آباد۔ محمد صفی اللہ خان لاہور کینٹ۔ اِرم سعید بیگم پُورہ لاہور۔ عدیل احمد قصور۔ صائمہ طارق عارف والا۔ فرحان عارف سمن آباد لاہور۔ عامر سلیم گڑھی شاہو لاہور۔ ظفر عباس وِکی ڈنڈوت۔ ہُما سعید اسلام آباد۔ بابر بشیر سیالکوٹ چھاؤنی۔ نیر نواز عادل ملتان۔ نسیمہ انور پُھلرواں۔ سدرہ ناصر پراچہ فیصل آباد۔ صابر اللہ مانسہرہ۔ یاسر زاہد پراچہ سمن آباد لاہور۔

اِس کارٹون کا عُنوان لکھیے اور 1000 روپے کے انعامات حاصل کیجیے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر ہے۔

ماہ اگست میں دیے گئے کارٹون کے بے شُمار عنوان موصول ہوئے۔ جج صاحبان کو ان عنوانوں میں سے صرف ایک عنوان "گیہوں کے ساتھ گُھن بھی پس جاتا ہے" پسند آیا۔ جن بچّوں نے یہ عنوان بھیجا ہے ان کے نام یہ ہیں:- ان بچّوں کو 20،20 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

سید مبین علی، راولپنڈی ـ نزہت صدیقی، لاہور ـ عدیل نواب، سرگودہا ـ حافظ عرفان علی جَرال، لاہور ـ سید حسن رضا زیدی، اسلام آباد۔ شیخ احسان قمر، وزیر آباد ـ شازیہ اصغر، لاہور ـ اسد عباس، ملتان ـ عثمان خان، لاہور کینٹ ـ محمد یاسر سعید، لاہور ـ فوزیہ رحمت، لاہور ـ محمد ہارون انصاری، اسلام آباد ـ شمشاد بانو، راولپنڈی ـ عائشہ تنویر، رسال پور ـ نعیم اللہ اعوان، گوجرہ ـ مظفر اقبال چوہان، حاجی والہ ـ محمد راشد حنیف، لاہور ـ عمران نذیر احمد، فیصل آباد ـ علی رضا خان، نارتھ کراچی ـ صادق علی ـ فیصل آباد ـ وقاص بن انعام، فیصل آباد ـ ارسلان ظہیر ـ گجرات ـ فیصل نواز، فیصل آباد۔ محمد اسرار الحق، راولپنڈی ـ زاہدہ صباء انعام، رحیم یار خان ـ عدیل ارشد، لاہور ـ محمد نعمان، اسلام آباد ـ عائشہ عظیم، راولپنڈی ـ سرمد عمران، لاہور ـ مرزا رشید احمد، اسلام آباد۔ آصف رشید، لاہور ـ عائشہ مشتاق، لاہور ـ جاوید اقبال، گوجر خان ـ شعیب الحسن ملک، ملتان ـ منصور شمسی، اسلام آباد ـ ہما انجم، ایبٹ آباد ـ عدنان مغیث، بہاولپور ـ فوزیہ ناصر، لاہور ـ محمد کشور رضا، سیت پور ـ خواجہ ناصر عباس، سیت پور ـ محمد نیر رضا، سیت پور ـ حمزہ سعید، جہلم ـ علی رضا پھلروان ـ شیر نواز، مردان ـ اظہر علی، فیصل آباد ـ وقار احمد انصاری، بہاولپور ـ رضوانہ سید ـ لاہور ـ عمران ضیاء، راولپنڈی ـ سید وقار احمد نقوی، ملتان کینٹ ـ حمزہ زبیر، لاہور ـ محمد سلمان، ملتان ـ

# مجھے شکایت ہے

صمد تجمّل ہاشمی، اسلام آباد

مجھے اس دنیا میں کسی سے شکایت نہیں ہے ۔ اگر شکایت ہے تو صرف اپنے آپ سے ۔

میں پاکستان کا ایک مسلمان شہری ہوں اور اپنے فرائض سے بھی باخبر ہوں ۔ مگر پھر بھی بے حسی کا مظاہرہ کر رہا ہوں ۔ مسلمان ہونے کے ناتے یہ احادیث نبویؐ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہیں جن میں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم مومنوں کو آپس میں رحم، محبت اور مہربانی کرنے میں یوں دیکھو گے گویا وہ ایک جسم ہیں اور جسم کے کسی حصے کو تکلیف ہو تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں اس کا ساتھ دیتا ہے"۔

ایک اور جگہ آپؐ نے فرمایا کہ مومن مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے، جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط بناتا ہے ۔ پھر آپؐ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کر کے بتایا کہ یوں ۔

اب اگر ہم اپنے اردگرد نظر ڈالیں تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ کیا ہم مسلمان ہوتے ہوئے ان احادیث نبویؐ پر عمل کر رہے ہیں ؟ ہرگز نہیں ۔ یہاں مسلمان مسلمان کے خلاف لڑ رہا ہے ۔ زبان اور نسل کی بنیاد پر فساد ہو رہے ہیں ۔ سندھی، پنجابی، بلوچی، پٹھان اور مُہاجر سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں ۔ یہ سب ایک دوسرے کی مضبوطی کا نہیں بلکہ کمزوری کا باعث بن رہے ہیں ۔ یہ اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ ایک دوسرے کے خلاف لڑ کر اپنے دشمنوں کے حوصلے بلند کر رہے ہیں اور اپنے ملک کی آزادی کو خطرے میں ڈال رہے ہیں ۔

میں یہ سب کچھ نہ صرف دیکھ رہا ہوں بلکہ آنے والے خطرے کو بھی محسوس کر رہا ہوں اس کے باوجود کچھ نہیں کر رہا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ خدانخواستہ اگر یہ ملک نہ رہا تو ہم بھی نہیں رہیں گے ۔

اس ساری صورت حال کو دیکھتے ہوئے اب آپ بتائیے کہ کیا مجھے اپنے آپ سے شکایت نہیں ہونی چاہئیے ؟ (پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

## 2

عاصمہ حئی، لاہور

مجھے شکایت ہے اپنے ان ہم وطنوں سے جو مختلف قومیتوں کا نعرہ لگاتے ہیں، اور اپنے صوبے میں رہنے والے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں ۔ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ ہمارا پیارا وطن پاکستان ، جسے ہمارے بزرگوں نے بے پناہ قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا، ہم سب کا سانجھا ہے ۔ ہم سب کا اس پر حق ہے ۔ یہ ہم سب کا وطن ہے ۔ یہاں نہ کوئی سندھی ہے، نہ پنجابی، نہ بلوچی ہے اور نہ پٹھان ۔ ہم سب پہلے پاکستانی ہیں اور بعد میں کچھ اور ہمارے پیارے قائداعظمؒ محمد علی جناح کا فرمان ہے:

"ہم مسلمان ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک کتاب پر یقین رکھتے ہیں ۔ پس یہ لازم ہے کہ ہم ملّت کی حیثیت سے بھی ایک ہوں کیونکہ اتحاد میں طاقت ہے ۔ اگر ہم خود کو پنجابی، سندھی وغیرہ پہلے اور مسلمان اور پاکستانی بعد میں سمجھنے لگیں گے تو پھر پاکستان پارہ پارہ ہو جائے گا ۔ ہم سب پاکستانی ہیں ، نہ بلوچی، نہ پٹھان، نہ سندھی، نہ پنجابی ۔ ہمیں صرف اور صرف پاکستانی کہلانے پر فخر ہونا چاہیے ۔ ہم جو کچھ محسوس کریں ، جو کچھ عمل کریں اور جو قدم بھی اٹھائیں وہ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ہو ۔ ہر شخص کو اپنے گاؤں، قصبے اور شہر سے محبت ہونی چاہیے اور اس کی خوش حالی اور ترقی کے لیے اسے محنت بھی کرنی چاہیے ۔ یہ بہت اچھی بات ہے لیکن اس سے زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے شہر اور قصبے کی نسبت اپنے ملک سے زیادہ محبت ہو ۔

قائداعظمؒ سے لوگ پوچھتے تھے "پاکستان کیوں بنایا گیا؟" آپؒ انھیں بتاتے تھے "مسلمان دوسری قوموں سے ایک الگ قوم ہیں، کیونکہ ان کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید پر ہے ۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم ایک ایسا ملک بنائیں جس میں ہم آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں، جس میں اسلامی تہذیب کو زندہ کیا جائے اور جہاں اسلامی اقدار کو پروان چڑھنے کا موقع ملے"۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے اتنا پیارا اور خُوب صورت ملک اس لیے حاصل کیا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں؟

آئیے سب مل کر یہ عہد کریں کہ ہم سب ایک ہو کر اور پاکستان کو قائداعظمؒ کی امانت سمجھ کر اس کی دل و جان سے حفاظت کریں

گے اور دشمنوں کی امیدیں کبھی پوری نہیں ہونے دیں گے ۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو آمین!

(دوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

## 3

نورین منظور، لاہور

مجھے شکایت ہے اپنے ابُّو سے جی ہاں، مجھے اپنے پیارے ابُّو جان سے شکایت ہے ۔ ابُّو جان نے مجھے بلکہ ہم سب کو بے حد پیار دیا ہے ہمیں سیر کرانے لے جاتے اور اکثر ہمارے ساتھ کھیلتے ۔ جب میں کلاس فورتھ میں تھی تو ہم سب مری گئے ۔ بہت لطف آیا ۔ تصویریں کھچوائیں اور خوب سیر کی ۔

لیکن پھر ایک دن ابُّو نے مجھ سے پوچھا کہ گڑیا بیٹے، تمہارے لیے کیا لاؤں؟ میں نے خوشی سے کہا کہ میرے لیے چابی والی گڑیا لائیں ۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ ابُّو جان ہم سب کو چھوڑ کر تین سال کے لیے سعودی عرب جا رہے ہیں ۔ یہ سُنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے ۔ مجھے یوں لگا کہ ہر چیز مجھ سے دور جا رہی ہے ۔ میں ابُّو سے لپٹ گئی اور بہت کہا کہ ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں مگر وہ نہ مانے اور آخر وہ دن آگیا جب ہم ان کو ائیرپورٹ چھوڑنے جا رہے تھے ۔ ہم سب ان سے گلے ملے اور وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جہاز میں سوار ہو کر دور بہت دور چلے گئے ۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ آخر اس دولت کا کیا فائدہ جو ہمیں اپنے پیارے باپ سے دور کر دے ۔ ابُّو جان ہم نے کب آپ سے فرمائش کی تھی کہ آپ ہمارے لیے دولت بٹورنے سمندر پار چلے جائیں؟ پیارے ابُّو مجھے یہ تمام چیزیں نہیں چاہئیں جو آپ نے ہمیں بھیجی ہیں ۔ یہ ہمیں وقتی آسائش اور آرام تو مہیا کر سکتی ہیں لیکن کیا ہم ان سے باپ کی محبت اور شفقت پا سکتے ہیں؟ کبھی نہیں ۔ گھر میں چاہے کتنا ہی سامان کیوں نہ آجائے، آپ کے بغیر سب بے کار ہے ۔ ہمیں صرف آپ کی ضرورت ہے صرف آپ کی۔

(تیسرا انعام: 40 روپے کی کتابیں)

## 4

جعفر حسین، کوئٹہ (پتا نہیں لکھا)

مجھے شکایت ہے ان اساتذہ سے جو اپنا فرض اس طرح انجام نہیں دیتے جو ایک ایماندار اور فرض شناس ٹیچر کا ہوتا ہے ۔ مجھے اپنے ان اساتذہ پر تنقید کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے ۔ مگر کیا کروں؟ ہم تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اسکول جاتے ہیں ۔ ہمارے والدین بڑی امیدوں کے ساتھ ہمیں اسکول بھیجتے ہیں ۔ مگر اسکول میں جس طرح ہمیں تعلیم دی جاتی ہے اسے تعلیم نہ ہی کہا جائے تو اچھا ہے ۔

کئی اساتذہ جن کا کلاسوں میں پیریڈ ہوتا ہے، اسٹاف روم میں آرام سے بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں ۔ کئی اساتذہ بجائے پڑھانے کے طالب علموں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں اور پورا پیریڈ اسی ہنسی مذاق میں گزار دیتے ہیں۔ خود میں جس اسکول میں پڑھتا ہوں وہاں کے ایک استاد کرسی پر بیٹھ کر اونگھتے رہتے ہیں ۔ پورے ہفتے میں صرف ایک یا دو پیریڈ پڑھاتے ہیں، وہ بھی ایسے کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔ میں یہ مانتا ہوں کہ تمام اساتذہ ایسے نہیں ہوتے ان میں سے بعض بہت فرض شناس ہوتے ہیں مگر تعلیم اس سفید چادر کی طرح ہے جس پر ذرا سا بھی داغ لگ جائے تو وہ بدنُما ہو جاتی ہے ۔

(چوتھا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

## 5

سید غفران ارشد، فیصل آباد

ہر آدمی کو کسی نہ کسی سے شکایت ہوتی ہے۔ مجھے محلے والوں سے شکایت ہے ۔ آئیے ، آج میں آپ کو ان کے کارنامے بتاتا ہوں۔

سب سے پہلے ہمارے سامنے والے صاحب کا حال سُنیئے۔ یہ صاحب صحت میں بھولو پہلوان کے رشتے دار دکھائی دیتے ہیں، اور کھانے پینے میں تو سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ جب بھی ہمارے گھر آتے ہیں تو جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ دنیا کے ہر موضوع پر روانی سے بحث کرتے ہیں اور اتنی دیر تک بیٹھے رہتے ہیں جب تک کہ کچھ کھانے پینے کو نہ آجائے۔ ان کو مہمان بننے کا تو بہت ہی شوق ہے۔ جب بھی ان کے بارے میں معلوم کرو تو پتا چلتا ہے کہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ صبح ناشتے سے پہلے نکلتے ہیں اور رات کو کھانا کھا کر واپس آتے ہیں۔ ان کو تو آپ جان ہی چکے ہیں۔ چلیے اب ہم اپنے ساتھ والوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔

ان صاحب کے چھوٹے بھائی کو دو ہی شوق ہیں، جن سے سارا

محلہ تنگ ہے ۔ ایک تو یہ حضرت مانے ہوئے کبوتر باز ہیں اور دُوسرے ان کو گلوکاری کا بہت شوق ہے ۔ صبح ہوتے ہی چھت پر چڑھ جاتے ہیں اور زور زور سے گانے لگتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی کبوتروں کے دڑبے میں گھس جاتے ہیں اور کبوتروں کے بہانے دوسروں کے گھروں میں بھی جھانک لیتے ہیں ۔

ہمارے ایک اور ہمسائے بہت مصروف لوگ ہیں ۔ صاحب اور بیگم دونوں نوکری کرتے ہیں اور صبح آٹھ بجے بچّوں کو نوکر کے حوالے کر کے خود دفتر چلے جاتے ہیں ۔ ان کا نوکر اور بچّے سارا دن گلی میں اودھم مچائے رکھتے ہیں ۔ ان کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق ہے اور تقریباً ہر گھر کا کوئی نہ کوئی شیشہ ، بلب نشانہ بنا چکے ہیں ۔ کچھ دیر تو کرکٹ کھیلتے ہیں اور پھر ان میں گھمسان کی جنگ ہوتی ہے ۔ پھر جب ان کے والدین آتے ہیں تو گلی میں قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے اپنے حصّے کی مار کھا کر اندر چلے جاتے ہیں ۔

میرے خیال میں کسی اور ہمسائے کا نام لینا اور ان کے بارے میں ذکر کرنا مناسب نہ ہو گا ، کیونکہ مجھے اس محلے میں رہنا ہے ۔

(پانچواں انعام : 30 روپے کی کتابیں)

# 6

سلمان الیاس ، فیصل آباد

بھئی سچ پوچھیں تو ہمیں ہر وقت کسی نہ کسی سے کسی نہ کسی قسم کی کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہے ۔

ایک تو گھر میں چھوٹا ہونا بھی عذاب ہے ۔ سب گھر والے رُعب جھاڑتے رہتے ہیں ۔ امّی ہر وقت ہمیں پڑھنے پڑھانے پر تُلی رہتی ہیں ۔ ابُّو اچھی عادتیں سکھانے پر اور بہنیں! ان کی تو کچھ نہ پوچھیے ہاتھ دھو کر تو کیا نہا دھو کر ہمارے پیچھے پڑی رہتی ہیں ۔ چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتیں ۔ ایک کو فکر ہوتی ہے کہ ہم ہوم ورک کر لیں ۔ دوسری کہتی ہے کپڑے استری کر دیے ہیں ، اب نہا لو تیسری کو ہماری صحت کی فکر رہتی ہے : یہ بھی کھاؤ وہ بھی کھاؤ اور آپی! توبہ! توبہ! اللہ معافی ان کو ہر وقت ڈانٹنے سے ہی فرصت نہیں ملتی ۔ یہ خراب کر دیا وہ خراب کر دیا چادریں اکٹھی کر دیں ، بستر گندا کر دیا ، فلاں چیز جگہ پر نہیں رکھی وغیرہ وغیرہ ۔ کہتے ہیں گھر کی باتیں باہر نہیں بتانی چاہئیں لیکن میرے خیال میں تو ہر گھر کا یہی حال ہے ۔ ہے ناں؟

اس کے بعد ہمیں اپنے بڑے سے بستے سے بھی شکایت ہے جس کی صحت ہماری صحت سے ماشاء اللہ دوگنی ہے ۔ پھر مِسوں سے شکایت ہے جو زیادہ ہوم ورک دے کر اپنے بچپن کا بدلہ ہم سے لیتی ہیں ۔ بڑے کہتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر ہی تو بڑے آدمی بنو گے ۔ لیکن ان آدمیوں کو کوئی نہیں دیکھتا جو پڑھے لکھے بغیر ہی بڑے ہو گئے ۔ ہمارے دادا ابُّو تو پڑھے لکھے نہ تھے پھر بھی بڑے آدمی بنے! ہمارے ابُّو سے بھی لمبے تھے ۔ اِن بڑوں کی باتیں ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں اور ہماری باتوں کے بارے میں بھی بڑے کچھ ایسا ہی کہتے ہیں ۔

اس کے بعد ہمیں شکایت ہے ان بسوں سے جن میں بیٹھنے یا کھڑے ہونے کو تو کیا چڑھنے کو بھی جگہ نہیں ہوتی ۔ اسی لیے ہم نے بس میں سفر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے ۔ کیونکہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اور خودکشی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ۔

شکایت تو ہمیں واپڈا والوں سے بھی ہے جو ہمارے پسندیدہ ٹی وی پروگراموں کے وقت بجلی بند کر دیتے ہیں اور خبرنامے کے وقت کھول دیتے ہیں ۔ آخر ہم نے واپڈا کا کیا قصور کیا ہے؟

اور ہاں ہمیں شکایت ہے ان مہمانوں سے بھی جو بن بلائے دھاوا بول دیتے ہیں اور پھر جانے کا نام ہی نہیں لیتے ۔ اگر ایسے مہمانوں کے آمد رحمت ہے تو پھر ہم زحمت میں ہی اچھے ہمیں ان ڈاکٹروں سے بھی شکایت ہے جو انجکشن لگانے کے بے حد شوقین ہیں ۔ اِدھر ہم بیمار ہوئے اُدھر ڈاکٹر صاحب کو انجکشن لگانے کی فکر لاحق ہوئی ۔ لاکھ سمجھاتے ہیں کہ انجکشن سے ہماری جان جاتی ہے ، کوئی دوا دے دیں ۔ مگر وہ ڈاکٹر صاحب ہی کیا جو مان جائیں ۔ خیر ہم بھی آسانی سے قابو میں آنے والے نہیں ۔ خوب دوڑ لگواتے ہیں ۔ لیکن آخر کار ڈاکٹر صاحب ہمیں پکڑ ہی لیتے ہیں اور پھر ٹیکے کی سوئی ہمارے جسم کے اندر اور "سی" ہمارے منہ سے باہر ۔ خدا کرے کبھی وہ وقت بھی آئے جب ہم ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر صاحب مریض ۔ پھر تو ہم اپنے اگلے پچھلے تمام انجکشنوں کا حساب چکا لیں گے ۔

اب ہم آپ کو کیا بتائیں کہ ہمیں اور کیا کیا شکایات ہیں ۔ ان کی فہرست تو خاصی طویل ہے اور ہم بہت چھوٹے ۔ او ہو! ایک شکایت تو ہم بھول ہی گئے جو ہمیں اپنے آپ سے ہے ۔ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ہمیں دوسروں سے اتنی شکایات کیوں ہیں؟ (چھٹا انعام : 25 روپے کی کتابیں)

# (7)

محمد رضوان سرائے صالح

31 مارچ 1987ء کو میں فرسٹ پوزیشن لے کر ساتویں جماعت میں پاس ہُوا ۔ مجھے اُس وقت اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ زمین پر پاؤں نہیں ٹِک رہے تھے ۔ مجھے انعام میں کورس کی کتابیں ملیں، اسی خوشی میں دوڑا دوڑا گھر پہنچا اور جلدی جلدی اپنے فرسٹ آنے کی خبر سُنائی ۔ امّی جان بُہت خوش ہُوئیں ، خدا کا شکر ادا کیا، مجھے مبارک باد دی اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھرے دوسرے بہن بھائیوں کی طرف دیکھنے لگیں ۔ اُن کا بھی آج ہی رزلٹ نکلنا تھا۔

میں پہلی سے ساتویں تک فرسٹ ڈوِژن میں پاس ہوا تھا۔ جب میں چھٹی جماعت میں پاس ہوا تو میرے بھائی جان نے کہا تھا کہ اگر رضوان ساتویں کلاس میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا تو اسے کیڈٹ کالج حسن ابدال میں داخل کرائیں گے ۔ میں یہ سُن کر خوشی سے پُھولا نہ سمایا تھا اور اُس وقت سے کیڈٹ کالج کے خواب دیکھ رہا تھا اور اب میرے خواب کی تعبیر کا وقت آن پہنچا تھا۔

میں نے رات کے کھانے پر ابُو سے بات کی کہ اب میرا داخلہ کیڈٹ کالج میں کروا دیں ۔ پہلے انہوں نے سوچا ۔ پھر کہنے لگے کہ اچھا تمہارے بھائی کو بھیجوں گا ۔ وہ فیس وغیرہ کا پتا کر آئے گا اور پراسپیکٹس بھی لے آئے گا ۔

دُوسرے دِن بھائی جان اپنے ایک دوست کو لے کر حسن ابدال چلے گئے ۔ میں بے چینی سے اُن کا مُنتظِر تھا۔ کوئی دو بجے کے قریب واپس آئے تو چہرے پر مایُوسی تھی ۔ میں نے پوچھا تو آہستہ سے بولے "پتا ہے تمہیں وہاں کی سالانہ فیس دس ہزار روپے ہے ۔ جو ہم نہیں دے سکتے ۔" یہ سُن کر میرا خواب کرچی کِرچی ہو کر بکھر گیا ۔ میں نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا مجھے ابُو نے کمرے سے نکالا اور پاس بیٹھ کر سمجھانے لگے کہ اب اِس بات کو روگ مت بناؤ۔ اُس رات مجھے نیند نہیں آئی ۔ ساری رات میں اپنی غریبی کو کوستا رہا جس نے میرے خواب کو حقیقت نہیں بننے دیا ۔ (ساتواں انعام : 20 رُوپے کی کتابیں)

اِن ہونہار ادیبوں کی تحریریں بھی اچھی ہیں ۔ اِن کو 15,15 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں؛

شمیم افضال ، کاہنہ نو ضلع قصور ۔ عذرا رفیق ، بنُّوں ۔ آفتاب احمد خٹک ، پشاور ۔ سلمان نثار ، کراچی ۔ سیف اللہ اعوان ، تحصیل گوجرہ ۔ سنیل کمار ، ضلع لسبیلہ ۔ فوزیہ بتول بھٹّی ، راولپنڈی ۔ شمائلہ برلاس ، ڈیرہ اسماعیل خان ۔ وسیم ارشد ، لاہور ۔ شمیمہ خاتون ، اورنگی ٹاؤن کراچی ۔ عمرانہ بتول ، مریدکے ۔ سیّد زاہد بہار ناز ، مظفر آباد ۔ سبین اکرم ، جہلم ۔ صائمہ کھوکھر ، گوجرانوالہ ۔ محمد انیس الصادقین ، کراچی ۔ رفعت لطیف ، سرائے عالم گیر ۔ محمد انجم مبین ، ڈیرہ اسماعیل خان ۔ نور احمد ، رحیم یار خان ۔ میمونہ رؤف ، پشاور ۔ محمد عباس ، رشید پور ۔ روبینہ رشید ، کراچی ۔ تابندہ انجم صالح ، پیر محل ۔ اکرام اللہ ، ڈیرہ اسماعیل خان ۔ صائمہ کنول ، مردان ۔ سیّد عون مہدی رضوی ، لاہور ۔ شہزاد شوکت علی ، کراچی ۔ کامران خاں ، رحیم یار خان ۔ ایم منظر رضا ، سیت پور ۔ عاصم بٹ ، واہ کینٹ ، زبیر حسین شاہ ، میانوالی ۔ مصحف رسول ، کراچی ۔ ندیم ظفر ، راولپنڈی ۔ سعدیہ نورین ، پشاور کینٹ ۔ نذیر احمد ، کراچی ۔ اختر علی ، پشاور ۔ کہکشاں غوری ، کراچی ۔ فرحانہ عاشق ، چُنگی امرسدھو لاہور ۔ مُصدق عنایت ، لالہ موسیٰ ۔ علی اصغر پڈّا ، گوجرانوالہ ۔ فریال وقار ، کراچی ۔ اظہر رسول ، شتاب گڑھ ۔ کامران طارق ، پشاور ۔ شمشاد مسیح ، کراچی ۔ فارینا رشید ، پشاور کینٹ ۔ طاہرہ پروین ، ملتان ۔ محمد تیمور خان ، اسلام آباد ۔ ابرار احمد ، پشاور ۔ عبداللہ عبید ، ملیر ہالٹ کراچی ۔ مسرور احمد ریحان ، اسلام آباد ۔ ثوبیہ صادق ، ریاض سعودی عرب ۔

**آپ بھی لکھئے** مندرجہ ذیل موضوعات پر کہانی لکھئے اور ایک ہزار روپے کے اِنعامات حاصل کیجئے

اکتوبر: ایک دلچسپ اتفاق ● نومبر: میرا کارنامہ

آخری تاریخ 10 ستمبر ● ایڈیٹر تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس لاہور

## ہونہار مصوّر

سید عمران حسین ، رحیم یار خان (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

صباحت منہاس ، اقبال ٹاؤن لاہور (دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں)

سیدہ کاشفہ خاتون نقوی ، کراچی (تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں)

امانت علی ، ڈھوک بابا حافظ جی (چوتھا انعام 25 روپے کی کتابیں)

جاوید جگنو ، ہارون آباد (پانچواں انعام 20 روپے کی کتابیں)

زینب بھٹی ، باغبان پورہ لاہور (چھٹا انعام 15 روپے کی کتابیں)

اِن ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:

عظمیٰ حاجی یونس ، کراچی ۔ جواد طیّب ، لاہور ۔ علیم احمد ، فیصل آباد ۔ اسماء اصغر، راولپنڈی ۔ توصیف احمد ، کراچی ۔ قیصر محمود ، مانسہرہ ۔ اویس عزیز شیخ ، فیصل آباد ۔ احمد مصطفیٰ خان ، کراچی ۔ وفا علاؤالدین شیخ ، کراچی ۔ نعمان ، بہاول نگر ۔ عظمیٰ نصیر وڑائچ ، سرگودھا۔ راجہ محمود شوکت ، جلال پور شریف ۔ محمد عاشق بھٹّی ، باغبان پورہ لاہور ۔ محمد انجم مبین ، ڈیرہ اسماعیل خان ۔ عدیل احمد ، قصور ۔ کاشف عزیز ، کراچی ۔ محمد حنیف خان ، کراچی ۔ سمن لئیق ، لاہور ۔ امتہ الوکیل احمد ، جہلم ۔ نعیم اللہ اعوان ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ ۔ حسین انور علی ، کراچی ۔ عامرہ نصیر وڑائچ ، سرگودھا ۔ نجیب اکبر میرانی ، گڈو سندھ ۔ سُہیل خان ، سرگودھا ۔ محمد رضوان ، سرائے صالح ۔ صباحت اختر، لاہور ۔ محمد ہاشم صدیقی ، شجاع آباد ۔ عمران بشیر ، کراچی ۔ محمد سلیم ، لاہور ۔ صبیح الدین ، لاہور ۔ عمر فیاض ، راولپنڈی ۔ ماریہ افضل ، ملتان۔

آپ ان موضوعات میں سے جس موضوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں:

آخری تاریخ 10 ستمبر | اکتوبر: گاؤں کا منظر | نومبر: سبزی منڈی

زمانۂ قدیم کے انسان نے اپنے اوزار اور ہتھیار سب سے پہلے پتھر، لکڑی یا ہڈی سے بنائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے دھاتیں دریافت کر لیں۔ اسے معلوم ہوا کہ دھاتیں نہائیت سخت اور چمکدار مادّے ہیں۔ ان سے زیادہ تیز ہتھیار اور مضبوط اوزار بنائے جا سکتے ہیں۔ تانبا سب سے پہلے دریافت ہونے والی دھات تھی۔ یہ قلعی (Tin) کے ساتھ آمیزے کی شکل میں ملتی تھی۔ اس آمیزے کو کانسی (Bronze) کہتے ہیں۔ 3500 قبل مسیح میں مصریوں نے کانسی کے اوزار اور ہتھیار استعمال کیئے۔ یہ کانسی کا دور تھا۔

لوہے کی تاریخ بھی کانسی جتنی پُرانی ہے۔لیکن قدیم زمانے کا انسان اس کے ذرائع سے بے خبر تھا۔البتہ 1500 قبل مسیح میں اُسے معلوم ہوا کہ بعض معدنیات جل کر لوہا بن جاتی ہیں۔ قدیم اناطولیہ (ترکی) میں سب سے پہلے فوج نے لوہے کے بنے ہوئے ہتھیار استعمال کیے۔ اِن سے انہوں نے ان فوجوں کو شکست دی جن کے پاس کانسی کے ہتھیار تھے۔ کانسی کی تلوار لوہے کی تلوار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یہ لوہے کے دور کا آغاز تھا جس سے ہم آج بھی گزر رہے ہیں۔ لوہا اور فولاد آج بھی مختلف اشیاء کی ساخت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ موٹر کاریں، زرعی و صنعتی مشینری اور ہتھیار وغیرہ لوہے یا فولاد سے تیار کیے جاتے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتوں میں لوہے اور فولاد کے شہتیر اور سریا وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہر سال 60 کروڑ ٹن سے زیادہ لوہا اور فولاد استعمال ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں ہم زیادہ تر لوہا معدنیات اور لوہے کی خام دھاتوں (Iron Ores) سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ زمین میں پائی جاتی ہیں اور کانیں کھود کر انہیں نکالا جاتا ہے۔ ایک خاص قسم کی بھٹی بلاسٹ فرنس (Blast Furnace) کے ذریعے خام دھاتوں سے لوہا حاصل کیا جاتا ہے۔ اس بھٹی میں خام دھات کو چونے کے پتھر اور کوک (Coke) (جو کہ کوئلے سے حاصل ہوتا ہے) کے ساتھ گرم کیا جاتا ہے۔ اس طرح لوہا مائع شکل میں علیٰحدہ بہہ جاتا ہے۔ اس کو ٹھنڈا کر کے سِلوں (Slabs) کی شکل میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ لوہا خالص نہیں ہوتا کیونکہ اس میں 3 سے 4 فی صد تک کاربن ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ معمولی ضرب لگنے سے

ٹوٹ جاتا ہے۔ لوہے سے زیادہ سے زیادہ کاربن نکال لی جائے تو فولاد (Steel) حاصل ہوتا ہے جس میں صرف 0.2 سے 1.5 فیصد کاربن ہوتی ہے۔

100 ٹن لوہا تیار کرنے کے لیے 190 ٹن خام دھات، 100 ٹن کوک اور 50 ٹن چونے کا پتھر استعمال ہوتا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی 50 ٹن دھات کا میل (Slag) بھی حاصل ہوتا ہے جو سیمنٹ کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔

لوہے سے فولاد بنانے کا آسان طریقہ سب سے پہلے 1856 میں ہنری بسمر نے دریافت کیا۔ اس طریقے سے پگھلے ہوئے لوہے سے ہوا گزاری جاتی ہے۔ ہوا کی آکسیجن لوہے کے کاربن سے عمل کر کے کاربن ڈائی آکسائیڈ بناتی ہے جو علیٰحدہ کر لی جاتی ہے۔ زمانۂ جدید میں اس طریقے کی بجائے کھلی چولہا بھٹی کا طریقہ استعمال کیا جا رہا ہے۔

فولاد لوہے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اگر فولاد میں 13 فیصد مینگنیز ملا دی جائے تو یہ نہایت سخت اور مضبوط بن جاتا ہے۔ اگر فولاد کو زنگ سے بالکل محفوظ کرنا ہو تو اس میں نکل اور کرومیم کے عناصر مِلا دیے جاتے ہیں۔

MECHANISM FOR RAISING AND LOWERING TOP CLOSING DEVICE
CHARGING PLATFORM
CHECKERWORK
STEEL SHELL
COMBUSTION CHAMBER
HOTGAS
COKE
REFRACTORY BRICKS
ORE AND FLUXSES
HOT AIR
LOADING TRUCKS
BLOWING ENGINE
SLAG
WASTE GASES
MOLTEN IRON
COLD BLAST
LADLE TO SAND MOULDS
HEARTH
HEARTH BOTTOM

بلاسٹ فرنس BLAST FURNACE
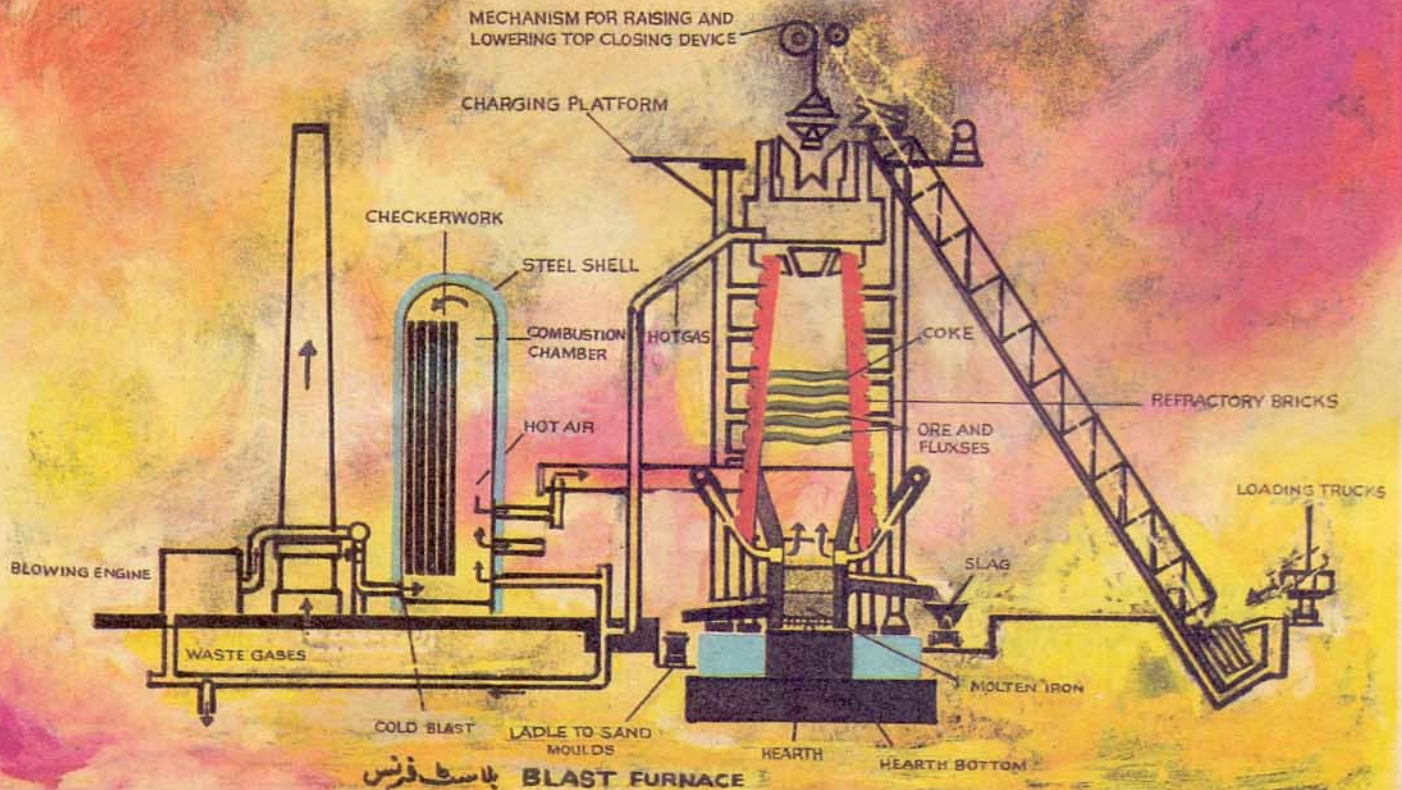
شہزادہ جلال خان بہار سے ملحقہ حکومت بنگال کے فرمانروا محمود شاہ لودھی کے دربار میں پہنچ گیا۔ اور اسے شیرخان پر حملہ کرنے کے لیے اُکسایا۔ محمود شاہ نے اپنے سپہ سالار قطب خان کو شیرخان کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ مگر وہ جنگ میں مارا گیا۔ اُس کے لشکر کو شکست ہوئی اور وہ تمام جنگی سازو سامان چھوڑ کر بھاگ گیا۔

محمود شاہ لودھی کو ہم پر حملہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ہم دونوں پٹھان بھی ہیں اور ہم دونوں کا مقصد بھی ایک ہی ہے کہ جیسے بھی ہو پٹھان حکومت کا کھویا ہُوا وقار دوبارہ بحال کیا جائے۔

بھائی جان!
اس حملے میں سازشیوں کا ہاتھ تھا۔
خدا کا شکر ہے کہ ان کی سازش ناکام رہی۔
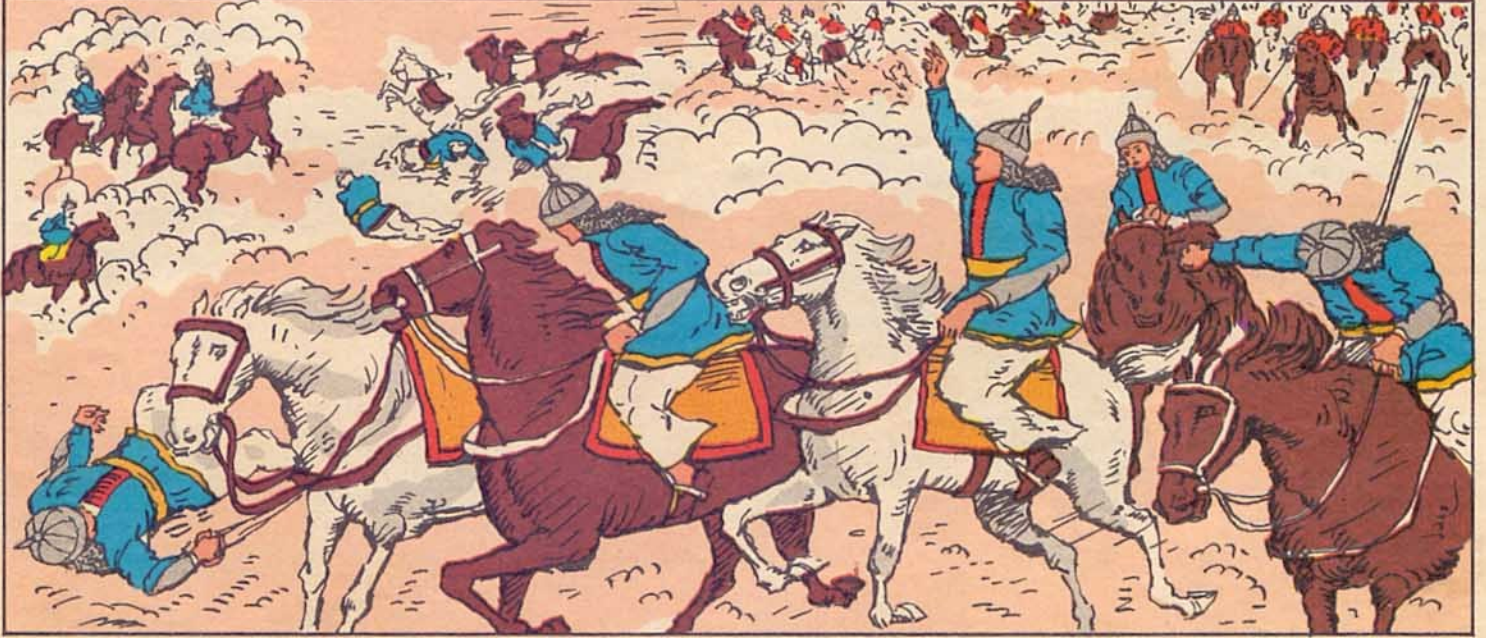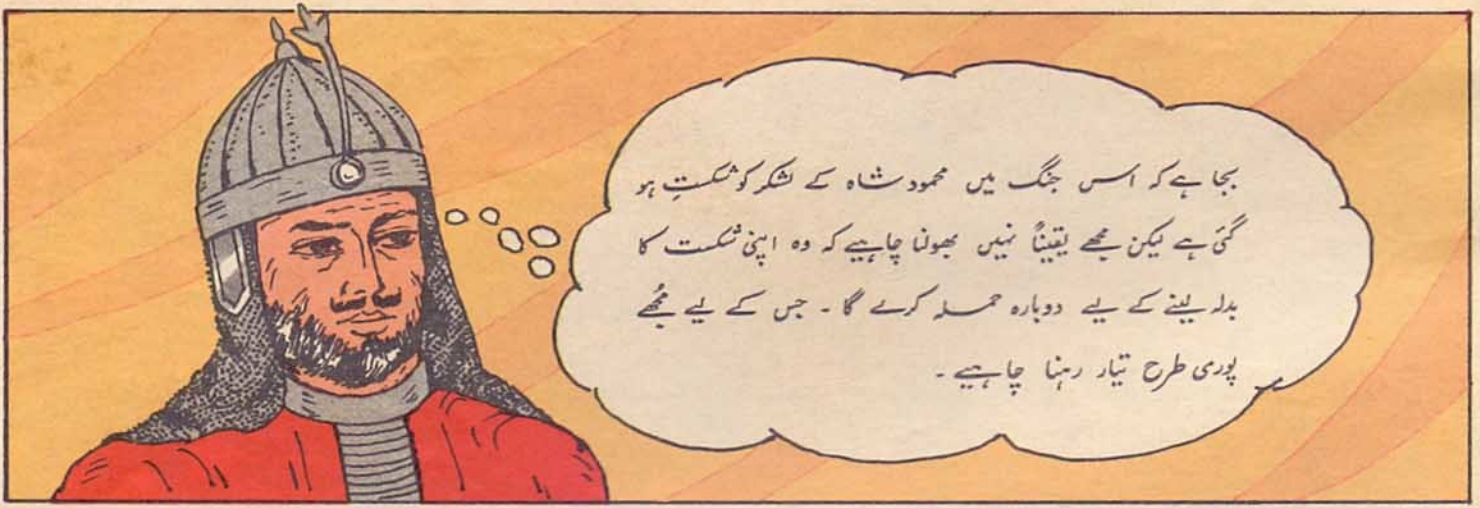
شیر خان نے جیسے سوچا تھا ویسے ہی ہوا۔ محمود شاہ نے ایک بہت بھاری لشکر اور توپ خانہ تیار کر لیا۔ قطب خان کے بہادر بیٹے ابراہیم خان کو لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا اور اسے شیر خاں پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ اُدھر شیر خاں بھی پوری طرح تیار تھا۔ اس نے حملہ آور لشکر اور اس کے توپ خانہ کے مقابلہ کے لیے ایک دانش مندانہ منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

نظام خان! اس دفعہ مقابلہ انتہائی سخت ہے جونہی دشمن حملہ کرے آپ اپنے دستے سے مقابلہ کریں، مگر تھوڑی دیر بعد اس دستے کی طرف پیچھے ہٹنا شروع کر دیں دشمن آپ کا پیچھا کرے گا۔ آپ بھاگ کر ادھر آجائیں وہاں میں اپنے دستے سمیت گھات میں بیٹھا ہوں گا جیسے ہی دشمن میری زد میں آجائے گا میں حملہ کر دوں گا۔ پھر آپ اپنے دستے کو یکجا کر کے سامنے سے بھرپور حملہ کر دیں اس طرح دشمن ہماری تلواروں کی زد میں آ جائے گا اور اسے توپخانے کے استعمال کا موقع بھی نہیں ملے گا۔

بہت خوب بھائی جان! کیا غضب کی ترکیب ہے انشاءاللہ فتح ہماری ہوگی۔

شیر خان کی جنگی حکمتِ عملی سے ابراہیم خان کو بھی شکست ہو گئی اور وہ میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتا ہُوا مارا گیا۔ شیر خان نے اس بہادر دشمن کی لاش کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ دفنا دیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں دشمن کا بہت سا جنگی سازو سامان، شاہی خزانہ اور توپ خانہ شیر خان کے ہاتھ لگا۔ اب شیر خان بے دھڑک ہو کر پورے بہار کا خود مختار حکمران بن گیا اور عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دھیان دینے لگا۔
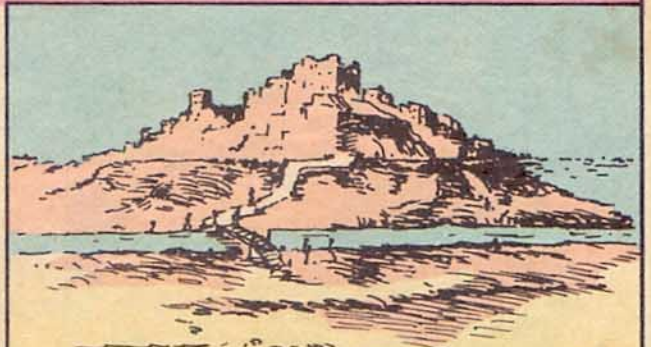
# قلعہ چنار

بہار کے پڑوس میں چنار کا مشہور اور ناقابلِ تسخیر قلعہ واقع تھا۔ دفاعی نقطۂ نظر سے یہ بہت اہم تھا۔ شیر خان کی خواہش تھی کہ یہ قلعہ اس کی سلطنت میں شامل ہو جائے۔ مگر اس کا اندازہ تھا کہ اس میں ابھی قلعہ فتح کرنے کی قوت نہیں ہے۔ قدرت خدا کی قلعہ کے حالات نے اچانک پلٹا کھایا۔ وہاں کے حکمران تاج خان کو اُس کے بیٹے نے قتل کر دیا۔ اس پر تاج خان کے مصاحبوں نے اسے جیل میں ڈال دیا۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ چونکہ تاج خان کے بعد ان کے قاتل بیٹے یا اُن کی ملکہ لاڈو بیگم میں سے کسی کو بھی حاکم نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ بہار کے حکمران شیر خان کو قلعہ کی حکومت سونپ دی جائے۔
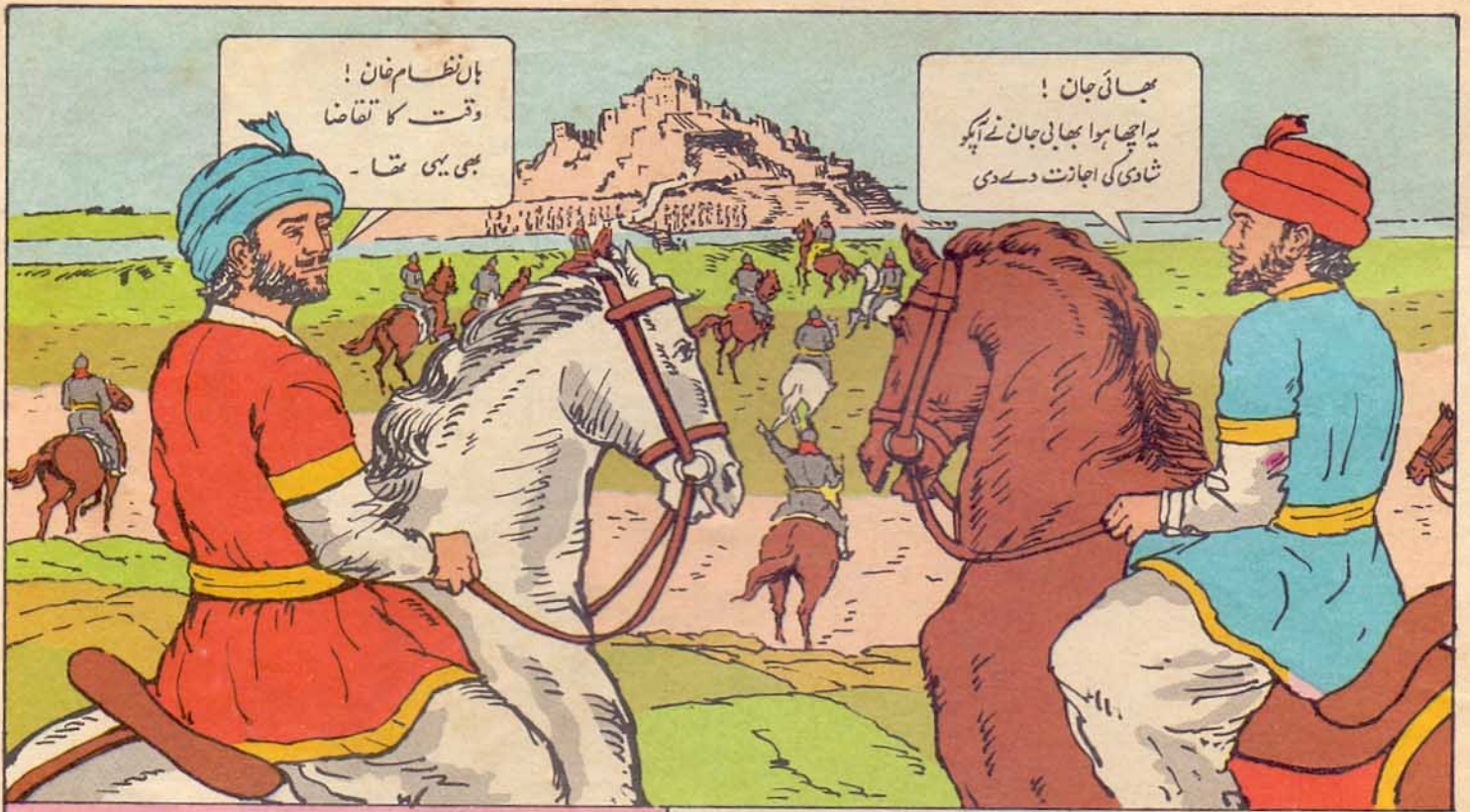
بھائی جان ! یہ اچھا ہوا بھابی جان نے آپکو شادی کی اجازت دے دی
ہاں نظام خان ! وقت کا تقاضا بھی یہی تھا ۔
قلعہ چنار میں شیرخان کا بڑی عزت و احترام سے استقبال کیا گیا ۔ قلعہ کی حکمرانی بھی مکمل طور پر اس کے سپرد کر دی گئی اس کے علاوہ لاڈو بیگم سے شادی بھی ہو گئی ۔ اس سے شیرخان کی قوت میں زبردست اضافہ ہُوا ۔
خوش آمدید ! خوش آمدید !! خوش آمدید !!!

وائلڈ لائف

# بٹیر

یہ یورپ، شمالی اور وسطی ایشیا، بھارت اور پاکستان سے لیکر افریقہ تک پایا جاتا ہے۔ موسمی نقلِ مکانی کرتا ہے۔ عام طور پر جوڑا جوڑا رہتا ہے۔ مگر جہاں خوراک کافی ہو وہاں بہت سے بٹیر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

جب بٹیر کو اُڑایا جائے تو تقریباً عمودی پرواز کرتا ہوا اڑتا ہے۔ موسمِ خزاں میں شمالی علاقوں سے اس کی بڑی بڑی ڈاریں جن میں 100 تک پرندے ہوتے ہیں، رات کے وقت شمال مغربی پاکستان میں داخل ہوتی ہیں۔ اور موسمِ سرما میں یہ پرندے سارے پاکستان اور بھارت میں پھیل جاتے ہیں۔ موسمِ بہار میں بہت سے بٹیر شمالی علاقوں میں دوبارہ نقلِ مکانی کرتے ہیں۔ کچھ بٹیر پاکستان میں نسل کشی کرتے ہیں۔

مادہ زمین پر بغیر تنکوں کا گھونسلا بناتی ہے اور 6 سے 13 تک انڈے دیتی ہے جو سُرخی مائل، بھورے رنگ کے ہوتے ہیں۔ 17 دن میں بچے نکل آتے ہیں اور 19 دن میں پرواز کے قابل ہو جاتے ہیں۔

**جنگلی حیات قومی وِرثہ ہے**

اِس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔

خوشی کے موقع پر
اپنے عزیزوں اور دوستوں کو
یہ خوبصورت اور رنگین
کتابیں تحفے میں دیجیے!

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
R. L. NO. 4756 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 8.00

ننھے مُنّوں کے لیے
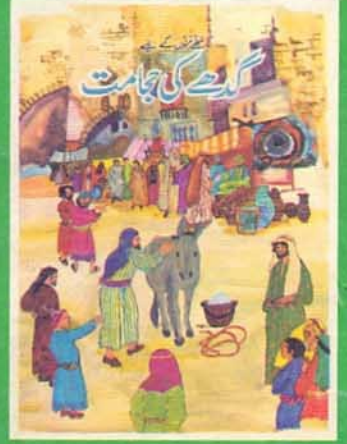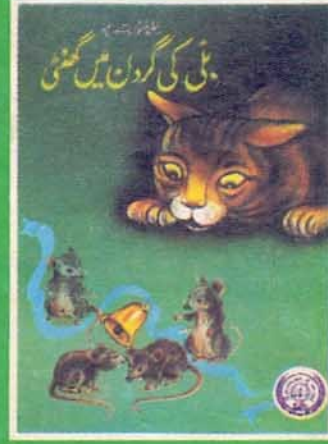
◎ حسین و رنگین تصویروں سے سجی ہوئی ◎

اس سلسلے کی 26 کتابیں شائع ہو چکی ہیں
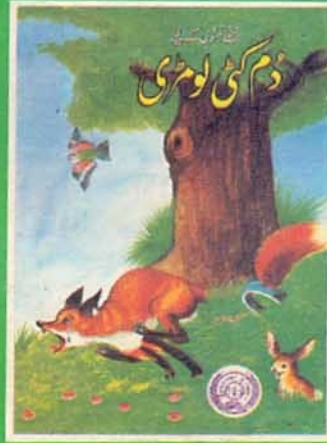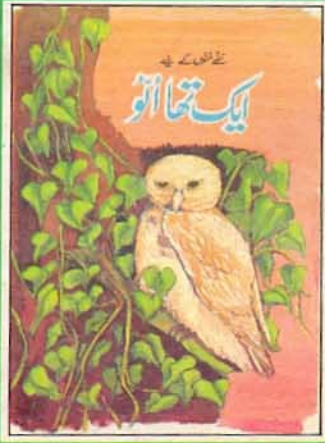
- جنگل کا راجا ✪ حاتم طائی ✪ دشمن کو حقیر نہ سمجھو
- دُم کٹی لومڑی ✪ خواجہ سگ پرست ✪ ایک تھی چیونٹی
- غرور کا سرنیچا ✪ رستم اور سہراب ✪ ایک تھا اُلو
- اتفاق کی برکت ✪ شہزادہ جانِ عالم ✪ شیخ چلی
- بلی کی گردن میں گھنٹی ✪ انگور کھٹے ہیں ✪ علی بابا چالیس چور
- شیخی خورا ✪ سونے کا انڈا ✪ گدھے کی حجامت
- خیالی پلاؤ ✪ ایک تھی ہرنی ✪ گل بکاؤلی
- بادشاہ کا انصاف ✪ چھوٹا نام، بڑا کام ✪ حاجی بغلول
- الٰہ دین اور جادو کا چراغ ✪ ایک تھی چڑیا

لاہور - راولپنڈی - کراچی